پاکستان کی اسلامی بنکاری میں رائج رننگ مشارکہ: شرعی اصول وضوابط کی روشنی میں ایک تحلیلی مطالعہ

محمد ابو بکر صدیق ۞

تعارف

شرکت ایک ایسا عقد ہے جس میں شرکا ایک دوسرے سے یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ اس عقد کے متوقع منافع جات میں باہم شریک ہوں گے تاکہ عقد کے ثمرات ہر ایک شریک تک نہایت مؤثر انداز میں پہنچیں اور نقصان کی صورت میں بھی وہ ایک دوسرے کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ اسلام نے سرمایہ دار کے لیے دو ہی راستے تجویز کیے ہیں کہ یا تو وہ اپنے بھائی کو اپنا زائد از ضرورت روپیہ بطور قرض حسنہ دے دے، ورنہ اُس کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو جائے اور نفع ونقصان میں حصہ دار بنے، لیکن اُس کے لیے تیسرا کوئی راستہ نہیں۔[1] اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت انسان کو حرص وہوس کا اس قدر اسیر بنا دیتا ہے کہ وہ حلال وحرام کی تمیز کیے بغیر کسبِ معاش کے لیے غرر، جوا اور چور بازاری جیسی نجاستوں سے بھی باز نہیں آتا۔ ناجائز نفع خوری اور اپنے سرمائے میں بڑھوتری کی دُھن میں سود تک کا مطالبہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ سود ہی سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کا وہ بنیادی عنصر ہے جو معاشرے میں غیر منصفانہ تقسیم دولت کا سبب بنتا ہے اور پورے معاشرے کی دولت کو چند ہاتھوں جمع کر دیتا ہے، گویا دولت کے دریاؤں کا بہاؤ چند سرمایہ داروں کی تجوریوں کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور تقسیم دولت کا یہ عدمِ توازن معاشرے کے مختلف طبقات میں احساس محرومی کے ساتھ اُن میں اخلاقی قباحتوں، تجارتی بدعنوانیوں اور غیر اخلاقی اشیا کے پھیلاؤ کا سبب بنتا ہے۔

۞ لیکچرر (پی ایچ ڈی اسکالر)، سکول آف اسلامک بینکنگ اینڈ فنانس، انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔ (muhammad.abubakar@iiu.edu.pk)

۱۔ محمد کرم شاہ الازہری، **مقالاتِ ضیاء الامت** (لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز)، ۲: ۱۰۳۔

جہاں بیوعات کی دیگر اقسام کو اسلامی بینکاری میں مختلف تمویلی سہولتوں کا ذریعہ بنایا گیا ہے وہیں مشارکہ کو بھی اسلامی بینکاری میں ایک اہم طریقۂ تمویل کے طور پر متعارف کرایا گیا تاکہ سودی نظام کی استحصالی قباحتوں کے برعکس نفع ونقصان میں شراکت کی بنا پر ایک ایسا نظام عمل میں لایا جاسکے جو شریعت مطہرہ کے قائم کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہو کر دولت کو چند ہاتھوں میں جمع کرنے کی بجائے متوازن اور منصفانہ تقسیم دولت میں اپنا کردار ادا کرے۔ چند سال قبل اسلامی بینکوں میں مشارکہ کی بنیاد پر رننگ مشارکہ کے نام سے ایک نئی پروڈکٹ متعارف ہوئی جس کا ڈھانچہ شرکت کی قسم شرکت العقد کے اصولوں پر تشکیل پاتا ہے۔ اسلامی دنیا کے نامور محققین اس پروڈکٹ کے حوالے سے کافی تحفظات رکھتے ہیں، کیوں کہ اُن کی نظر میں رننگ مشارکہ بھی انھی خرابیوں کا باعث بن رہا ہے جن کی بنا پر سود کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ فی الوقت یہ بات انتہائی اہمیت اختیار کر چکی ہے کہ رننگ مشارکہ کا فقہی اور شرعی تجزیہ کیا جائے اور اس کی جزئیات میں جا کر معاملے کی حقیقت کو جانا جائے۔

اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ شرکت العقد کے بنیادی فقہی تصور کی وضاحت کرتے ہوئے اسلامی بینکوں میں رائج رننگ مشارکہ کا عملی ڈھانچہ بیان کیا جائے اوراس کے ساتھ رننگ مشارکہ کے حوالے سے چند اہم فقہی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی جائے تاکہ شرکت العقد کے اسلامی تصوّر اور اسلامی بینکوں میں اُس کی عملی تعبیر میں موجود اشتراک و افتراق نمایاں ہو جائیں۔ تاہم اس مقالے کا بنیادی مقصد اِن اہم سوالوں کا جواب تلاش کرنا ہے کہ رننگ مشارکہ میں فریقین کے مابین شراکت کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ فریقین میں سرمایہ داری کس تناسب سے ہوتی ہے اور کیا فریقین کے مابین نفع ونقصان کی تقسیم میں اس تناسب کا اظہار بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ فریقین کے مابین نفع ونقصان کی تقسیم کن اصولوں کے تحت کی جاتی ہے؟ کیا سودی بینکاری نظام کی طرح یہاں بھی منافع جات کا بہاؤ کسی ایک فریق کی جانب تو نہیں ہوتا؟ ایک شریک یا مضارب عقدِ شرکت یا مضاربت میں قرض، ہبہ یا کسی حق سے دست بردار ہونے میں کس قدر آزاد ہوتا ہے؟ کیا یہ پروڈکٹ متوازن تقسیمِ دولت میں معاون ثابت ہو رہی ہے یا نہیں؟ شرکت کی حد تک اسلامی بینکاری کے ایک درست متبادل نظام ہونے کے دعوے کو پرکھنے کے لیے مندرجہ بالا سوالات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سوالات کے ساتھ چند ضمنی سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں جو ہر سوال سے متعلق ضمنی بحث میں اٹھائیں جائیں گے اور اُن پر بحث کی جائے گی۔

شرکت: لغوی اور اصطلاحی معنیٰ ومفہوم

امام فخر الدین الزیلعی رحمۃ اللہ علیہ (۷۴۳ھ)[۲] شرکت کا لغوی معنی یہ بیان کرتے ہیں: "وَهِيَ عِبَارَةٌ عَنْ اخْتِلَاطِ النَّصِيبَيْنِ فَصَاعِدًا بِحَيْثُ لَا يُعْرَفُ أَحَدُ النَّصِيبَيْنِ مِنْ الْآخَرِ"[۳] (دو یا زیادہ حصوں کا آپس میں اس طرح مل جانا کہ ان کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہے)۔ اور امام الزَّبِيدِيّ حنفی رحمۃ اللہ علیہ (۸۰۰ھ)[۴] کے نزدیک شرکت کا لغوی معنی ہے الْخُلْطَةُ (مل جانا)۔[۵] امام البابرتی رحمۃ اللہ علیہ (۷۸۶ھ)[۶] کہتے ہیں: عقد کا نام

۲۔ امام عثمان بن علی فخر الدین زیلعی حنفی کی اصل صومالیہ کا ایک علاقہ ہے۔ حصول تعلیم کے لیے آپ ۷۰۵ھ کو قاہرہ تشریف لے گئے۔ اس کے بعد وہیں تدریس اور افتا کے فرائض سرانجام دیے۔ آپ نے ۷۶۲ھ کو قاہرہ میں ہی وفات پائی۔ آپ کی تصنیفات میں **تبيين الحقائق في شرح كنز الدقائق، تركة الكلام على أحاديث الأحكام، شرح الجامع الكبير** قابل ذکر ہیں۔ [خير الدين بن محمود الزركلی (۱۳۹۶ھ)، **الأعلام** (بيروت: دار العلم للملايين، ۲۰۰۲ء)، ۴: ۲۱۰۔

۳۔ عثمان بن علی الحنفی الزیلعی، **تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق** (بيروت: دار الكتب العلمية)، ۴: ۲۳۴۔

۴۔ امام ابو بکر بن علی الزَّبیدی حنفی فقیہ تھے۔ آپ یمن کے ایک گاؤں زَبید میں پیدا ہوئے۔ جس کی نسبت سے آپ کو الزَّبيدي کہا جاتا ہے۔ آپ ساری زندگی اسی گاؤں میں رہے اور بالآخر ۸۰۰ھ کو اسی گاؤں میں ہی وفات پائی۔ آپ کی تصنیفات میں **السراج الوهاج، الجوهرة النيرة، سراج الظلام ، تفسير الحداد** اور **كشف التنزيل في تحقيق التأويل** قابل ذکر ہیں۔ (الزرکلی، مرجع سابق، ۲: ۶۷۔)

۵۔ ابو بکر بن علی الزَّبِيدِيّ (۸۰۰ھ)، **الجوهرة النيرة** (المطبعة الخيرية، ۱۳۲۲ھ)، ۱: ۲۸۵۔

۶۔ اکمل الدین البابرتی ۷۱۴ھ / ۱۳۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ بغداد کے گاؤں "بابرت" کی طرف نسبت سے البابرتی مشہور ہیں۔ حنفی فقیہ، امام، محقق، باریک بین، ماہر علم حدیث اور عربی اصول وادب کے اساتذہ میں سے ہیں۔ علم حاصل کرنے کیلئے پہلے حلب اور پھر قاہرہ کے سفر کئے۔ کئی مرتبہ عہدہ قضاء پیش کیا گیا مگر آپ نے اسے قبول نہیں کیا۔ آپ نے ۷۸۶ھ کو مصر میں وفات پائی۔ آپ کی تصنیفات میں **شرح تلخيص الجامع الكبير للخلاطي، العقيدة، العناية في شرح الهداية، شرح مشارق الأنوار، التقرير، شرح وصية الإمام أبي حنيفة** قابل ذکر ہیں۔ (الزرکلی، مرجع سابق، ۷: ۴۲۔)

شرکت اس لیے رکھا گیا کہ اسی کے سبب مختلف حصے باہم مل جاتے ہیں۔[۷] امام ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ (۸۶۱ھ)[۸] فرماتے ہیں:"وَالشِّرْكَةُ لُغَةً خَلْطُ النَّصِيبَيْنِ بِحَيْثُ لَا يَتَمَيَّزُ أَحَدُهُمَا"[۹] (شرکت کا لغوی معنی ہے: دو حصوں کا آپس میں اس طرح مل جانا کہ ان کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہے)۔ امام الزَّبِيدِيّ حنفی رحمۃ اللہ علیہ (۸۰۰ھ) کے نزدیک شرکت کی اصطلاحی تعریف یہ ہے: "الشَّرِكَة عِبَارَةٌ عَنْ عَقْدٍ بَيْنَ الْمُتَشَارِكِينَ فِي الْأَصْلِ وَالرِّبْحِ"[۱۰] (شرکت ایسے عقد سے عبارت ہے جس میں فریقین اصل سرمائے اور منافع میں شریک ہوں)۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۵۲ھ)[۱۱] نے بھی شرکت کی یہی تعریف ذکر کی ہے۔[۱۲] ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ علیہ (۲۰۱۵ء) شرکت کی دیگر تعریفات سے موازنہ کرنے کے بعد اِسی تعریف کو ترجیح دیتے ہیں۔[۱۳] کلاسیکل اور جدید کتب فقہ میں شرکت کو شرکتِ ملک اور شرکت عقد میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ رننگ مشارکہ پروڈکٹ چوں کہ شرکتِ عقد کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہے اس لیے یہاں صرف شرکت عقد سے متعلق بنیادی تفصیل پیش کی جائے گی۔

۷۔ اکمل الدین البابرتی، **العناية شرح الهداية** (بیروت: دار الفكر)، ۶: ۱۵۲۔

۸۔ کمال الدین محمد ابن ہمام کی پیدائش ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء کو اسکندریہ میں ہوئی۔ ۸۱۳ھ کو قاہرہ تشریف لے گئے جہاں قاضی محب الدین ابن شحنہ سے استفادہ کیا۔ حلب اور حرمین کے جوار میں بھی قیام کیا۔ فتح القدیر کے نام سے ہدایہ کی ایسی محققانہ شرح لکھی کہ جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ اس شرح کو آپ نے کتاب وکالت تک تصنیف کیا تھا کہ ۸۶۱ھ/۱۴۵۷ء کو قاہرہ میں داعی اجل کو لبیک کہا، اس لیے باقی شرح قاضی زادہ مفتی رومی متوفی ۹۸۸ھ نے مکمل کیا۔ آپ کی دیگر تصانیف میں **التحرير، المسايرة في العقائد المنجية في الآخرة، زاد الفقير** قابل ذکر ہیں۔ (الزرکلی، مرجع سابق، ۶: ۲۵۵۔)

۹۔ کمال الدین محمد ابن ہمام، **فتح القدير**، (دار الفكر)، ۶: ۱۵۲۔

۱۰۔ زبیدی، مصدر سابق، ۱: ۲۸۵۔

۱۱۔ محمد امین بن عمر ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء کو دمشق میں پیدا ہوئے۔ شاکر السالمی العمری العقاد سے تفسیر، حدیث اور علوم عقلیہ پڑھے اور انھی کی ترغیب سے مسلک حنفی اختیار کیا۔ ۲۱ ربیع الثانی ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء کو وصال ہوا۔ آپ کی تصانیف میں **رد المحتار على الدر المختار** قابل ذکر ہیں۔ (الزرکلی، مرجع سابق، ۶: ۴۲۔)

۱۲۔ محمد امین ابن عابدین (۱۲۵۲ھ)، **رد المحتار على الدر المختار**، (بیروت: دار الفكر، ۱۹۹۲ء)، ۴: ۲۹۹۔

۱۳۔ وہبہ الزحیلی (۲۰۱۵)، **الفقه الإسلامي و أدلته** (دمشق: دار الفكر، ۱۹۸۵)، ۴: ۷۹۳۔

شرکة العقد

ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ علیہ (۲۰۱۵ء) شرکتِ عقد کی تعریف یوں کرتے ہیں: دو یا دو سے زیادہ افراد کی سرمائے اور منافع میں شرکت، شرکتِ عقد کہلاتی ہے۔[14] شرکتِ عقد کی تعریف یوں بھی کی جاتی ہے: ''اِتِّفَاقُ اِثْنَیْنِ اَوْاَکْثَرَ عَلٰی خَلْطِ مَالَیهِما اَوْعَمْلَیهِما اَوْ اِلْتِزامَیهِما فِی الذِّمة، بِقَصْدِ الْاِسْتِرْبَاحِ''[15] (دو یا دو سے زیادہ لوگوں کا وہ عقد جس کے تحت نفع کمانے کی غرض سے وہ اپنے اثاثے، محنت یا ذمہ داریاں ملالیتے ہیں شرکتِ عقد کہلاتا ہے)۔

فقہا نے شرکتِ عقد سے متعلق طویل بحث کی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے: بنیادی طور پر شرکت کی تین قسمیں ہیں۔ ایک شرکتِ اموال ہے، جس میں سارے شریک سرمایہ کی بنیاد پر کسی کاروبار میں شرکت کرتے ہیں اور اپنے نسبتی حصے کے مطابق کاروبار میں ملکیت پاتے ہیں۔ دوسری شرکتِ اعمال ہے جس میں افراد اپنے اپنے ہنر اور فن کی بنیاد پر شرکت کرتے ہیں جیسے دو یا دو سے زائد درزیوں کا باہم مل کر کام شروع کرنا۔ اِسے شرکۃ الصنائع، شرکۃ الابدان اور شرکۃ تقبّل بھی کہا جاتا ہے۔ تیسری شرکتِ وجوہ ہے جس میں افراد اپنی ساکھ کی بدولت اُدھار پر مال اُٹھاتے ہیں اور نفع پر بیچتے ہیں۔ اِسے شرکتِ ذمم بھی کہتے ہیں۔ احناف اور حنابلہ شرکت کی اس قسم کو جائز مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک شرکا طے شدہ تناسب کے مطابق نقصان برداشت کرتے ہیں۔ اگر انھوں نے ابتدا میں کوئی تناسب طے نہ کیا تو پھر ہر شریک اپنے لیے ہوئے اُدھار کو خود ادا کرے گا اور جو شرکا کام کر رہے ہوں گے، انھیں منافع کے بجائے مزدوری یا تنخواہ ملے گی۔ شوافع شرکت کی اس قسم کو ناجائز کہتے ہیں جب کہ مالکیہ اس شرط پر جائز تصوّر کرتے ہیں کہ عقد کی ابتدا میں اُدھار پر خریداری اور مُنافع پر اُس کی فروخت کا معاہدہ کر لیا جائے۔ حنفی فقہا کے نزدیک شرکتِ عقد کی مندرجہ بالا ہر قسم، شرکتِ مفاوضہ ہوتی ہے یا شرکتِ عنان۔ شرکتِ مفاوضہ وہ ہے جس میں شرکا سرمائے، عمل، حقوق، نفع و نقصان یا خدمات وغیرہ کے معاملے میں ایک دوسرے کے مساوی ہوں جو کہ بہت مشکل ہے۔ شرکتِ عنان ایسی شرکت ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ افراد اِس طرح شریک ہوں

۱۴۔ نفس مرجع، (هي عِبارَة عَنِ الْعَقْدِ الْوَاقِعِ بَيْنَ اِثْنَيْنِ أَوْاَكْثَر لِلْاِشْتِرَاكِ فِيْ مَالٍ وَرِبح۔)

۱۵۔ **المعايير الشرعية**، الشركة، (بحرین: هيئة المحاسبة والمراجعة للمؤسسات المالية الإسلامية، ۲۰۱۰ء)، رقم المعيار: ۱۲، دفعہ: ۲۔

کہ اُن کے سرمائے، عمل، حقوق، منافع، نقصان یا خدمات مساوی نہ ہوں۔ شرکتِ ملک کے برخلاف شرکتِ عقد میں شرکا ایک دوسرے کے وکیل ہوتے ہیں، لیکن کفیل نہیں ہوتے۔[۱۶] اسلامی مالیاتی اداروں میں تجارتی معاملات عام طور پر شرکتِ عقد (شرکتِ عنان) کے مطابق ہی طے ہوتے ہیں۔

شرکتِ عقد کی بنیادی شرائط

فقہانے شرکتِ عقد کی صحت کے لیے درج ذیل شرائط مقرر کی ہیں:[۱۷]

۱. تمام شرکا عاقل و بالغ ہوں، وہ کسی دباؤ کے بغیر عقد پر باہم رضامند ہوں، یہ شراکت دھوکہ، فراڈ اور غرر سے پاک ہو، عقد کی ابتدا سے ہی شرکت کا سرمایہ معلوم اور متعیّن ہو، شرکتِ عقد کی ابتدا میں عقد کی اختتامی مدت کا تعیّن کر دیا جائے، شرکا ایک دوسرے کے وکیل ہوں گے، ان کے مابین نفع کی شرح کا تعیّن کسی دباؤ کے بغیر باہم رضامندی سے ہو۔

۲. شرکا میں منافع اُن کے سرمائے کے تناسب سے تقسیم ہوگا۔ یعنی اگر ایک شریک کا سرمایہ عقد کے کل سرمائے کا ۲۰ فیصد ہے تو اُس شریک کا نفع کل منافع کا ۲۰ فیصد ہوگا۔ اگر شریک خدمت بھی سرانجام دے تو اُس کے لیے اِس سے زائد نفع بھی مقرر کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ **فتاویٰ عالمگیری** میں ہے: "لَوْ كَانَ الْمَالُ مِنْهُمَا فِي شَرِكَةِ الْعِنَانِ وَالْعَمَلُ عَلَى أَحَدِهِمَا إِنْ شَرَطَا الرِّبْحَ عَلَى قَدْرِ رُءُوسِ أَمْوَالِهِمَا جَازَ وَيَكُونُ رِبْحُهُ لَهُ وَوَضِيعَتُهُ عَلَيْهِ وَإِنْ شَرَطَا الرِّبْحَ لِلْعَامِلِ أَكْثَرَ مِنْ رَأْسِ مَالِهِ يَصِحُّ الشَّرْطُ وَيَكُونُ مَالُ الدَّافِعِ عِنْدَ الْعَامِلِ مُضَارَبَةً."[۱۸] (اگر کاروبار میں سرمایہ دونوں فریقوں کا ہو اور کام صرف ایک فریق کرے اور رأس المال کے تناسب سے نفع آپس میں تقسیم کر لیا جائے اور نقصان کے دونوں فریق ذمہ دار ہوں تو یہ جائز ہے۔ اگر کام کرنے والا اپنے رأس المال کے تناسب سے زیادہ نفع کا طالب ہو تو یہ بھی جائز ہے۔ کام کرنے والا جو زائد رقم لے گا وہ بطور مضاربت ہوگی۔)

۱۶- علاؤالدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی (۵۸۷ھ)، **بدائع الصنائع في ترتیب الشرائع**، (بیروت: دار الکتب العلمیة، ۱۹۸۶)، ۶: ۵۶۔

۱۷- شرائط (نمبر ۱ سے نمبر ۷) کتاب الشرکة، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع سے ماخوذ ہیں۔

۱۸- **الفتاوی الهندية**، (بیروت: دار الفکر ۱۳۱۰ھ)، ۲: ۳۲۰۔

۳. شرح نفع کا تعیّن کل سرمائے کی بنیاد پر نہ ہو بلکہ مستقبل میں کمائے جانے والے غیر معلوم نفع کی بنیاد پر ہو۔ مثلاً اگر نفع کا تعیّن اس طرح کیا کہ ہر شریک کو اُس کے سرمائے کا دس فیصد ملے گا، تو اس سے مشارکہ باطل ہو جائے گا۔ نفع کے تعیّن کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے کہ ہر شریک کو کل نفع کا دس فیصد ملے گا۔[۱۹] یعنی شرح نفع کا تعلق شرکت کے سرمائے کی بجائے مستقبل میں کمائے جانے والے منافع کے ساتھ ہونا چاہیے۔

۴. کسی شریک کے لیے مال کی ایک معیّن مقدار بطور نفع مقرر کرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً اگر ایک شریک کہے کہ وہ ہر ماہ دس ہزار روپے منافع لے گا۔ تو یہ ناجائز ہے کیوں کہ ممکن ہے کہ کل منافع ہی دس ہزار ہو تو یوں باقی شرکا کے حصے میں کچھ بھی نہیں آئے گا یا کل منافع دس ہزار سے کم ہو۔[۲۰] تو اُس کا نفع کہاں سے ادا کیا جائے گا۔

۵. نقصان ہونے کی صورت میں ہر شریک اپنے سرمائے کے تناسب کی حد تک نقصان میں شریک ہو گا۔ جیسا کہ کاروبار کے نفع و نقصان کے متعلق امام برہان الدین المرغینانی (۵۹۳ھ)[۲۱] ایک حدیث کا ذکر کرتے ہیں: اَلرِّبْحُ عَلٰی مَا شَرَطَا وَالوَضِيْعَةُ عَلٰی قَدْرِ المَالَيْنِ[۲۲] (نفع شرکا کی شرائط کے مطابق تقسیم ہو گا اور نقصان سرمایہ کے تناسب سے برداشت کرنا ہو گا)۔

۶. نقصان کی تقسیم کے وقت اگر کوئی شریک چاہے تو دوسرے شریک یا شرکا کے حصے کا نقصان برداشت کر سکتا ہے بشرطے کہ یہ بات معاہدے میں پہلے سے شرطاً ذکر نہ کی گئی ہو۔[۲۳] اسی طرح اگر کوئی شریک

۱۹۔ الکاسانی، مصدر سابق، ٦: ۵۹۔

۲۰۔ **الفتاوى الهندية**، ۲: ۳۲۰۔

۲۱۔ علی بن ابو بکر ۵۱۱ھ / ۱۱۳۵ء کو ماوراء النہر کے شہر مرغینان میں پیدا ہوئے اسی نسبت سے آپ کو المرغینانی بھی کہا جاتا ہے۔ مذہب حنفی میں بطور حافظ، مفسر، محقق، ادیب اور کبار مجتہدین میں شمار ہوتے ہیں۔ کتاب **الهداية** فقہ حنفی کی بنیادی اور امہات الکتب میں شمار ہوتی ہے۔ ابن کمال پاشا انھیں مجتہدین فی الکمال میں شمار کرتے ہیں۔ آپ نے ۵۹۳ھ / ۱۱۹۷ء کو سمرقند میں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف میں **شرح الجامع الكبير للشيباني، بداية المبتدي، الهداية** اور **كفاية المنتهي**، ذکر ہیں۔ (محمد بن عبد الحی لکھنویؒ، **الفوائد البهية في طبقات الحنفية** (قاہرہ: دار الکتب الإسلامي)، : ۱۴۱۔)

۲۲۔ ابو الحسن برہان الدین المرغینانی (۵۹۳ھ)، **الهداية** (بيروت: دار إحياء التراث العربي)، ۳: ۹۔

۲۳۔ **المعايير الشرعية**، الشركة، معیار نمبر: ۱۲، دفعہ نمبر: ۳ / ۱ / ۵ / ۴۔

تقسیم منافع کے وقت دوسرے شریک کو اپنے حصے کا کچھ نفع ہبہ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے بشرطے کہ یہ بات معاہدے میں پہلے سے شرطاً ذکر نہ کی گئی ہو۔(۲۴)

۷۔ اگر سب کے سب شرکا فعّال ہیں تو وہ اپنے اپنے سرمائے کے تناسب سے نفع وصول کریں گے اور اگر ان میں کوئی شریک زیادہ تجربہ کار، محنتی، باصلاحیت ہے تو شرکا کی باہم رضامندی سے اُس کا حصہ اُس کے سرمائے کے تناسب سے زیادہ بھی مقرر کیا جا سکتا ہے(۲۵) تاہم ہر شریک نقصان میں صرف اپنے سرمائے کے تناسب سے شریک ہو گا۔اگر مشترکہ کاروبار میں کوئی غیر فعّال شریک ہے تو اس کا نفع زیادہ سے زیادہ اُس کے سرمائے کے تناسب کے برابر مقرر کیا جا سکتا ہے۔

شرکتِ عقد سے متعلق یہ وہ چند شرائط ہیں جن سے شرکتِ عقد کے صحیح یا فاسد ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔رننگ مشارکہ چوں کہ شرکت کی اِسی قسم پر مبنی ہوتا ہے اس لیے ان شرائط کے تناظر میں رننگ مشارکہ کے فقہی اور شرعی تجزیے کو سمجھنا آسان ہو گا۔

رننگ مشارکہ کا پس منظر

سودی بینک اپنے کلائنٹ کی کاروباری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قرض کی بنیاد پر قرضے سے پہلے رقم کی ایک خاص حد (Limit) مقرر کر دیتا ہے جہاں سے وہ وقفے وقفے سے مختلف مقدار میں رقم نکلواتا رہتا ہے اور جب اس کے پاس رقم میسر ہوتی ہے تو وہ واپس جمع بھی کراتا رہتا ہے۔یہ سلسلہ ایک مقررہ مدت (Maturity date) تک جاری رہتا ہے۔کلائنٹ جتنی رقم استعمال کرتا ہے، وہ صرف اُس رقم پر یومیہ پیداوری کے حساب کی بنیاد پر مروّجہ KIBOR کے مطابق سود ادا کرتا ہے۔(۲۶) سودی بینک کی اس سہولت کو رننگ فنانس کہا جاتا ہے۔اس سہولت کے تحت کلائنٹ جو رقم نکلواتا اسے Overdraft(۲۷) کہا جاتا ہے۔

شریعت کی نظر میں یہ پروڈکٹ اس وجہ سے ناجائز ہے کہ کاروباری شخص نے کاروبار سے ہونے والے نفع/نقصان سے قطع نظر صرف ایک مخصوص رقم کے برابر منافع ادا کرنا ہے جو سود ہے۔عام طور پر ایسے سرمایہ

۲۴۔ نفس مرجع، دفعہ نمبر: ۳/ ۱/ ۵/ ۲۔

۲۵۔ ابوالحسن السُّغدی الحنفی (۴۶۱ھ)، النتف في الفتاوى، (بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۹۸۴)، ۱: ۵۳۳۔

26– http://www.comparebanks.com.pk/running-finance/

۲۷۔ جب کلائنٹ کے اکاؤنٹ میں اپنا پیسہ نہ ہو تو بینک اسے قرض کی بنیاد پر رقم فراہم کرتا ہے اور اس پر خاص شرح سے سود وصول کرتا ہے۔اس صورت کو اوور ڈرافٹ کہا جاتا ہے۔

دار افراد کا اپنا سرمایہ بہت کم ہوتا ہے جب کہ بینکوں کی جانب سے انھیں بہت بھاری رقوم دی جاتی ہیں جن پر وہ منافع کماتے ہیں۔ کاروبار میں کم سرمایہ لگا کر زیادہ نفع وہ لے اُڑتے ہیں اور کم منافع بینک کو سود کی شکل میں دے دیتے ہیں اور بینک اس کم منافع میں سے سود کی صورت میں ایک فکس منافع ڈپازٹرز میں تقسیم کرتا ہے۔ گویا جس نے بھاری رقم مہیا کی اسے منافع کم اور جس نے کم سرمایہ لگایا اسے منافع زیادہ ملتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا یہی وہ استحصالی عنصر ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں دولت کی منصفانہ تقسیم نہیں ہوپاتی۔ غریب غربت کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے جب کہ امیر سرمایہ دار کے دھن میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ فقہا رننگ فنانس کو سود اور دیگر فقہی اشکالات کی بدولت ناجائز گردانتے ہیں۔

چوں کہ رننگ فنانس سودی لین دین کی ایک واضح شکل ہے، اس لیے علما نے اسلامی بینکوں کو اس پروڈکٹ کی اجازت نہیں دی۔ تاہم ۲۰۰۲ء میں شرکت العقد کی بنیاد پر رننگ مشارکہ کا ایک انوکھا تصور پیش کیا گیا جس میں یومیہ حاصل کی بنیاد پر شراکتی سرمایہ فراہم کرنے کا مشورہ دیا گیا۔[۲۸] رننگ مشارکہ کے مؤیدین کی جانب سے رننگ مشارکہ پر ممکنہ اعتراضات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے جواز پر دلائل دیے گئے۔[۲۹] لیکن رننگ مشارکہ میں بہت زیادہ فقہی اشکالات پائے جانے کی وجہ سے اہل علم نے اسے قبول نہ کیا۔

رننگ مشارکہ: تعارف

رننگ مشارکہ ایسی تمویلی سہولت ہے جس کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اسلامی بینک شرکت العقد کے تحت کلائنٹ کے کاروبار میں شریک بن جاتا ہے۔ سرمایہ فراہم کرنے کی صورت یہ طے کی جاتی ہے کہ اسلامی بینک سرمائے کی ایک خاص حد مقرر کر دیتا ہے جس سے کلائنٹ سودی اوور ڈرافٹ کی طرح "جب اور جتنی چاہے" کی بنیاد پر رقم نکلوا اور جمع کرا سکتا ہے۔ یہ سہولت ایک خاص مدت جیسے ایک سال کے لیے دی جاتی ہے۔[۳۰] اسلامی بینک یہ تمویلی سہولت صرف کارپوریٹ یعنی بڑے کسٹمرز کو فراہم کرتا ہے۔ اس سہولت کے تحت کلائنٹ کو ایسی کاغذی کارروائی وں سے نہیں گزرنا پڑتا جیسی کاغذی کارروائی وں کا اُسے مرابحہ یا اجارہ وغیرہ میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ رننگ مشارکہ کا تعلق شرکتِ عقد کی قسم شرکتِ عنان سے ہے۔

28– M. Taqi Usmani, *An Introduction to Islamic Finance* (Karachi, 2000), 68-74.

۲۹– دیکھیے: عمران اشرف عثمانی، **شرکت و مضاربت عصر حاضر میں**، (کراچی: ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء)، ۳۹۰۔

30– Muhammad Ayub, Running Musharakah' by Islamic Banks in Pakistan: Running from Musharakah or Moving back to Square One, JIBM, 6(1), 2016, Editorial, 10-11.

رننگ مشارکہ کا طریقہ کار

۱. خالد ایک کلائنٹ ہے جسے اپنی رواں کاروباری ضروریات کے لیے رقم کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ رقم کے حصول کے لیے کسی اسلامی بینک سے رجوع کرتا ہے۔ اسلامی بینک خالد کے بزنس کی گزشتہ چند سالوں کی مالیاتی رپورٹس دیکھتا ہے جس سے وہ اس کے بزنس کے قابل اعتماد اور منافع بخش ہونے کا اندازہ لگاتا ہے اور اس کے بعد اُسے تمویلی سہولت دینے کی حامی بھرتا ہے۔

۲. اسلامی بینک خالد کے کاروبار میں شرکتِ عقد کی بنیاد پر شریک بن جاتا ہے۔ شراکت کی ایک خاص مدت جیسے ایک سال مقرر کر دی جاتی ہے۔ اس شرکت میں اسلامی بینک کی حیثیت ایک غیر فعّال شریک (Sleeping Partner) کی ہوتی ہے۔ جب کہ خالد فعّال شریک (Active Partner) ہوتا ہے۔

۳. اسلامی بینک اور خالد کے مابین شراکتی معاہدہ کے تحت منافع کی تعیین دو سطحوں پر کی جاتی ہے۔ پہلی سطح پر نفع کی بالائی حد بندی کی جاتی ہے جسے Profit Ceiling یا مطلوبہ منافع (Target Profit) بھی کہا جاتا ہے جیسے یہ طے کرنا کہ کل منافع میں سے کل سرمائے کے ۷ فیصد کے برابر کی رقم تک اسلامی بینک اور خالد کے مابین منافع کی تقسیم اُن کے سرمائے کے تناسب سے ہوگی۔ مطلوبہ منافع کو اسلامی بینک سودی معیار KIBOR سے منسلک کرتا ہے۔ معاہدے میں طے کیا جاتا ہے کہ (KIBOR∓۱ مثال کے طور پر) اسلامی بینک کے لیے ۷ فیصد منافع تک تو نفع کی تقسیم فریقین کے سرمائے کی نسبت سے ہوگی اور جونہی اسلامی بینک کو مطلوبہ منافع مل جائے گا، شراکتی نسبت اس طرح بدل جائے گی کہ اضافی منافع عملاً سارا کا سارا کلائنٹ کو دے دیا جائے گا۔ گویا اسلامی بینک کلائنٹ کو اپنا Target rate دے دیتا ہے کہ وہ کل منافع میں سے اپنے سرمائے کے ۷ فیصد کے برابر نفع لے گا۔ جب کہ اس حد سے زائد منافع کی رقم میں اسلامی بینک 00001. فیصد کا مطالبہ کرے گا[۳۱] اور بقیہ 99.99999 فیصد خالد کو دے دیا جائے گا۔ (سادہ لفظوں میں اِس اضافی شرح منافع کا مفہوم یہ ہوگا کہ

۳۱۔ اسلامی بینکوں کے رننگ مشارکہ کے اگر ابتدائی عقود ملاحظہ کیے جائیں تو پتا چلتا ہے کہ معین حد سے زائد منافع میں اسلامی بینک کا حصہ ۰۱. فیصد بھی رہا، پھر کچھ عرصہ بعد ۰۰۱. فیصد بھی ہوا پھر ۰۰۰۱. فیصد ہوا تاہم اب کچھ بینکوں میں ۰۰۰۰۱. فیصد بھی مروّج ہے۔

ہر ایک لاکھ روپے پر اسلامی بینک کا نفع ایک روپیہ جب کہ خالد کا منافع ننانوے ہزار نو سو ننانوے روپے ہو گا۔ اور اسلامی بینک وہ ایک روپیہ اپنے ڈپازٹر میں تقسیم کرے گا)۔

۴. مثال کے طور پر اسلامی بینک رنگ مشارکہ کی مد میں خالد کے لیے ۱۰ کروڑ روپے کی سہولت خاص کر دیتا ہے۔ شراکت کے اختتام پر اسلامی بینک کا سرمایہ ۱۰ کروڑ روپے، کلائنٹ کا سرمایہ ۴ کروڑ روپے اور کل منافع ۳ کروڑ روپے بنتا ہے۔ تو طے کردہ شرط کے مطابق اِن ۳ کروڑ روپوں میں سے صرف ۹۸ لاکھ روپے اسلامی بینک اور خالد کے مابین اُن کے سرمائے کے تناسب سے تقسیم ہوں گے کیوں کہ کل سرمائے کا ۷ فیصد یہی رقم بنتی ہے۔ جب کہ بقیہ منافع 2.2 کروڑ روپے میں سے اسلامی بینک صرف مبلغ ۲۰۲ روپے وصول کرے گا اور باقی ماندہ 20,199,798 روپے خالد کو ملیں گے۔ تفصیل مندرجہ ذیل ٹیبل میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

رنگ مشارکہ کی تمویلی سہولت کی حد	روپے 100,000,000
رنگ مشارکہ کے اختتام پر تقسیم منافع	
اسلامی بینک کا سرمایہ =	روپے 100,000,000
خالد کا سرمایہ =	40,000,000 روپے
کاروبار کا کل سرمایہ =	140,000,000 روپے
اسلامی بینک کی مطلوبہ شرح منافع =	7فیصد یعنی .07
منافع کی حد بندی =	مطلوبہ شرح منافع x کل سرمایہ
	9,800,000 = 140,000,000 x .07روپے
کاروبار کا کل منافع=	30,000,000 روپے
نفع میں اسلامی بینک کا حصہ=	حد بندی منافع X (اسلامی بینک کا سرمایہ / کل سرمایہ)
	7,000,000 =.714 x 9,800,000 روپے

نفع میں خالد کا حصہ =	حد بندی منافع X (خالد کا سرمایہ / کل سرمایہ)
	2,800,000 =.285 x 9,800,000روپے
حد بندی سے زائد منافع کی تقسیم	
حد بندی سے زائد منافع =	کل منافع - حد بندی منافع= 20,200,000 روپے
نفع میں اسلامی بینک کا حصہ =	0.00001 x (20,200,000) فیصد
	202 روپے
نفع میں خالد کا حصہ =	99.99999 x (20,200,000) فیصد
	20,199,798 روپے

۵. اسلامی بینک اور خالد کے مابین یہ طے پاتا ہے کہ خالد شرکت کے اختتام یعنی ایک سال تک اسلامی بینک کو ایک خاص فیصد شرح مثلاً (KIBOR + 1%) کے حساب سے ماہانہ نفع ادا کرتا رہے گا۔ خالد اسلامی بینک کو یہ ماہانہ نفع ایکروئل بنیادوں (Accrual basis)[۳۲] پر ادا کرتا ہے۔ یہی اسلامی بینک کا مطلوبہ نفع ہوتا ہے۔ ایک سال کے بعد اسلامی بینک کے کل منافع کا حساب ہوتا ہے تو اس وقت ماہانہ وصول شدہ نفع کا تصفیہ کر دیا جاتا ہے۔[۳۳] مندرجہ بالا حساب میں تصفیہ کے بعد اسلامی بینک کو صرف دوسو دوروپے (۲۰۲) ملتے ہیں جو عملاً ایسے حیلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کے تحت یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی بینک نے ایک مقرر شرح سود پر سرمایہ فراہم کیا اور جواز کے لیے شراکت کا سہارا لیا۔

۳۲۔ ایکروئل کا مطلب ہوتا ہے کہ منافع واجب الوصول ہے تاہم حقیقی طور پر اس کی وصولی اس وقت ہوگی جب کاروبار کا حساب کتاب ہوگا لیکن اسلامی بینک اپنی ماہانہ پول مینیجمنٹ کی ضرورت کے پیش نظر اس شرط پر کلائنٹ سے اپنا منافع ایڈوانس میں ہر ماہ وصول کرتا ہے کہ حقیقی وصولی کے وقت اس کا تصفیہ کر لیا جائے گا۔

۳۳۔ رننگ مشارکہ سے متعلق اسلامی بینکوں کی جانب سے کسی قسم کے لٹریچر اور تفصیل کا موجود نہ ہونا از خود اس پروڈکٹ کی صحت کو مشکوک کر دیتا ہے، تاہم رننگ مشارکہ سے متعلق کچھ معلومات جناب محمد ایوب کے ایڈیٹوریل اور میزان بینک کے جناب احمد علی صدیقی کی رننگ مشارکہ پریزنٹیشن سے اخذ کی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی بینکوں کے ٹرینرز اور پریکٹیشنرز سے بھی معلومات لی گئی ہیں۔

رننگ مشارکہ میں پائے جانے والے اشکالات

رننگ مشارکہ کے مندرجہ بالا سٹرکچر کو دیکھنے کے بعد مندرجہ ذیل اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کے جواب کی روشنی میں ہی رننگ مشارکہ کے شرعی جواز یا عدم جواز کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے:

١. رننگ مشارکہ میں اسلامی بینک اور کلائنٹ کے سرمائے کی مقدار کا تعیّن کب اور کیسے ہوتا ہے؟

٢. کیا رننگ مشارکہ میں شرح منافع کی تعیین مشارکہ کے شرعی اصولوں کے مطابق ہے؟

٣. رننگ مشارکہ میں اسلامی بینک کی جانب سے سرمایہ نقدی کی صورت میں ہوتا ہے۔ جب کہ کلائنٹ کا سرمایہ اثاثہ جات یا مخلوط صورت میں ہوتا ہے تو کیا اس صورت میں شراکت کی صحت کے لیے شرکا کے سرمایوں کا باہم اختلاط لازمی ہے؟

٤. اسلامی بینکوں میں ڈیپازٹس کے حصول کے لیے استعمال ہونے والے مضاربہ میں کیا کسی مضارب یعنی اسلامی بینک کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ راس المال سے حاصل ہونے والے منافع میں سے کسی کو ہبہ کر سکے یا منافع کے ایک کثیر حصے، جس میں رب المال کا حق بھی شامل ہو، میں سے 99.99999 فیصد منافع کسی تیسرے فریق کو دے دے؟ نیز مضاربہ مطلقہ میں ایک مضارب فیصلے لینے میں کس حد تک آزاد ہوتا ہے؟

٥. کیا نتائج و عواقب کے اعتبار سے رننگ مشارکہ رننگ فنانس سے واقعی ایک مختلف امر ہے؟ شارع کی نگاہ میں شراکت / مشارکہ حقیقی منافع کی عادلانہ تقسیم کا ذریعہ ہے۔ کیا رننگ مشارکہ شارع کے اس مقصد کو پورا کرتا ہے؟ کیا رننگ مشارکہ کے ذریعے دولت صرف صنعت کار کلائنٹ کے ہاتھوں میں مرتکز نہیں ہوتی؟ جب کہ اس طرح کا ارتکاز دولت شریعت کے معاشی احکام کی روح کے سراسر منافی ہے۔

٦. کے برعکس تقسیم دولت میں توازن برقرار رکھنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے؟

رننگ مشارکہ کے بارے میں کسی بھی نتیجے تک پہنچنے کے لیے اِن سوالات کے ساتھ ساتھ چند دیگر ضمنی سوالات کا جواب تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ ضمنی سوالات آگے کی بحث میں اٹھائے جائیں گے۔

رننگ مشارکہ میں سرمائے کی مقدار کا علم

رننگ مشارکہ میں فریقین کے سرمائے کی درج ذیل دو صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ اسلامی بینک کا سرمایہ وہی Limit یا "تمویلی سہولت کی حد" ہوتی ہے جو اسلامی بینک اپنے شریک کے لیے ابتدا

میں خاص کر دیتا ہے اور خالد کے سرمائے کی مقدار بھی ابتدائے عقد میں واضح طور پر بیان کر دی جاتی ہے۔ دوسری صورت یہ کہ اسلامی بینک اور کلائنٹ کے سرمائے کی مقدار کا حتمی تعیّن شرکت کے آخر میں یومیہ حاصل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

رننگ مشارکہ کا جائزہ لینے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سرمائے کے تعیّن کے حوالے سے رننگ مشارکہ دوسری صورت کا مصداق ہے۔ کیوں کہ رننگ مشارکہ میں اسلامی بینک اور کلائنٹ کے سرمائے کی مقدار عقد کے شروع سے لے کر آخر تک نامعلوم رہتی ہے۔ کیوں کہ کلائنٹ مختلف اوقات میں رقم نکلواتا اور جمع کراتا رہتا ہے اور شرکت کی مقررہ مدت یعنی ایک سال بعد دیکھا جاتا ہے کہ کلائنٹ نے کتنی رقم کتنی مدت کے لیے استعمال کی ہے۔ جتنی رقم کلائنٹ نے استعمال کی ہوتی ہے صرف اُسی استعمال شدہ رقم کو ہی اسلامی بینک کا سرمایہ شمار کیا جاتا ہے جس سے یہ معاملہ واضح ہو جاتا ہے کہ سرمائے کی مقدار کا تعیّن انتہائے شرکت کے وقت ہوتا ہے۔

"جاری مشارکہ اکاؤنٹ" کی بحث میں سرمائے کی مقدار معلوم ہونے سے متعلق سے ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں: "قدیم فقہا کے نقطہ ہائے نظر اس بارے میں مختلف ہیں کہ کیا مشارکہ کے صحیح ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کل راس المال کی مقدار شرکا کو پہلے سے معلوم ہو۔ حنفی فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ مشارکہ کے لیے یہ بات شرط نہیں ہے۔"[٣٤]

غالباً جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی اس سے مراد یہ ہو گی کہ احناف کے نزدیک مشارکہ کا عقد کرتے وقت صرف انعقادِ مشارکہ کے لیے راس المال کی مقدار کا علم شرط نہیں ہے۔ یہ قیاس اس لیے بھی کیا ہے کہ مفتی صاحب نے اس کے بعد مشہور حنفی فقیہ امام الکاسانی (٥٨٧ھ)[٣٥] کی مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں:

٣٤۔ محمد تقی عثمانی، **اسلام اور جدید معاشی مسائل** (لاہور: ادارہ اسلامیات پبلشرز، ٢٠٠٨ء)، ٥: ٦١۔

٣٥۔ ابو بکر بن مسعود الکاسانی ماوراء النہر کے علاقے کاسان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بخارا میں شیخ محمد بن احمد سمرقندیؒ سے اُن کی عظیم تصنیف **تحفة الفقهاء** کو پڑھا اور **بدائع الصنائع** نام سے اس کی شرح کی جسے دیکھ کر شیخ بہت خوش ہوئے اور اپنی بیٹی فاطمہؒ جو تحفة الفقهاء کی حافظہ تھیں، آپ کے نکاح میں دے دی۔ حلب کے مدرسہ الحلاویہ میں تدریس بھی کی۔ امام الکاسانیؒ نے ٥٨٧ھ/١١٩١ء کو حلب میں وفات پائی۔ آپ کی تصنیفات میں **بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع**، **السلطان المبين في أصول الدين** قابل ذکر ہیں۔ (کمال الدین ابن العدیم (٦٦٠ھ)، **بغية الطلب في تاريخ حلب**، (دار الفکر)، ١٠: ٤٣٤٨۔)

وَأَمَّاالْعِلْمُ بِمِقْدَارِ رَأْسِ الْمَالِ وَقْتَ الْعَقْدِ فَلَيْسَ بِشَرْطٍ لِجَوَازِ الشَّرِكَةِ بِالْأَمْوَالِ عِنْدَنَا، وَعِنْدَ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللهُ شَرْطٌ وَجْهُ قَوْلِهِ أَنَّ جَهَالَةَ قَدْرِ رَأْسِ الْمَالِ تُؤَدِّي إِلَى جَهَالَةِ الرِّبْحِ، وَالْعِلْمُ بِمِقْدَارِ الرِّبْحِ شَرْطُ جَوازِ هَذَا الْعَقْدِ، فَكَانَ الْعِلْمُ بِمِقْدَارِ رَأْسِ الْمَالِ شَرْطًا.وَلَنَا أَنَّ الْجَهَالَةَ لَا تَمْنَعُ جَوَازَ الْعَقْدِ لِعَيْنِهَا بَلْ لِإِفْضَائِهَا إِلَى الْمُنَازَعَةِ، وَجَهَالَةُ رَأْسِ الْمَالِ وَقْتَ الْعَقْدِ لَا تُفْضِي إِلَى الْمُنَازَعَةِ؛ لِأَنَّهُ يُعْلَمُ مِقْدَارُهُ ظَاهِرًا وَغَالِبًا؛ لِأَنَّ الدَّرَاهِمَ وَالدَّنَانِيرَ تُوزَنَانِ وَقْتَ ال شرا ، فَيُعْلَمُ مِقْدَارُهَا فَلَا يُؤَدِّي إِلَى جَهَالَةِ مِقْدَارِ الرِّبْحِ وَقْتَ الْقِسْمَةِ.[٣٦]

جہاں تک عقد کے وقت سرمائے کی مقدار کے معلوم ہونے کا تعلق ہے تو ہمارے (احناف) نزدیک شرکت (الاموال) کے جواز کے لیے یہ شرط نہیں ہے۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ شرط ہے، کیوں کہ اُن کے نزدیک سرمائے کی (مقدار کی) جہالت نفع کی (شرح کی) جہالت کا سبب بنتی ہے۔ جب کہ نفع کی مقدار (شرح) کا معلوم ہونا شرکت (الاموال) کے جواز کی شرط ہے، پس اس سبب سرمائے کی مقدار کا علم بھی شرط ہے۔ جب کہ ہمارے یعنی احناف کے نزدیک سرمائے کی (مقدار کی) جہالت عقد کے جواز میں صرف اُس وقت مانع ہوتی ہے جب وہ (فریقین کے مابین) جھگڑے کا سبب بنے، جب کہ یہاں سرمائے کی جہالت عقدِ شرکت کے وقت باہمی نزاع کا سبب نہیں بنتی کیوں کہ غالب طور پر اس کی مقدار کا علم ہو جاتا ہے، اس لیے کہ (شراکتی کاروبار کے لیے) خرید و فروخت کے وقت عموماً دراہم و دنانیر کا وزن کر لیا جاتا ہے پس اس سبب سرمائے کی مقدار معلوم ہو جاتی ہے جو منافع کی تقسیم کے وقت شرح منافع میں جہالت کا سبب نہیں رہتی۔

امام الکاسانی (۵۸۷ھ) کی یہ عبارت واضح بتا رہی ہے کہ سرمائے کی مقدار کا تعین انعقادِ شرکت میں تو مانع نہیں ہے لیکن شرکت کی عملاً ابتدا کے لیے یہ تعین لازمی ہے۔ لیکن رنگ مشارکہ کا جواز نکالنے کے لیے حقیقت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے[٣٧] امام الکاسانی (۵۸۷ھ) کی مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم ہی بدل دیا گیا اور کہا گیا: ”مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بوقتِ عقد سرمایہ اگرچہ معلوم نہ ہو تب بھی شرکت عقد منعقد ہو جاتی ہے، البتہ صرف اتنی شرط ہے کہ نفع کی تقسیم کے وقت سرمایہ کی مقدار معلوم ہونی چاہیے تاکہ نفع کی تقسیم میں کسی قسم کا نزاع پیدا نہ ہو۔“[٣٨]

٣٦۔ الکاسانی، مصدر سابق، ٦: ٦٣۔

٣٧۔ محمد عمران اشرف عثمانی ”مشارکہ کارواں اکاؤنٹ“ کی بحث میں سرمائے کی مقدار معلوم ہونے سے متعلق لکھتے ہیں: حنفی فقہائے کرام اس بارے میں متفق ہیں کہ سرمایہ کا پہلے سے معلوم ہونا مشارکہ کے منعقد ہونے کے جواز کے لیے کوئی شرط نہیں۔ (عمران اشرف عثمانی، مرجع سابق، ۳۹۳۔)

٣٨۔ عمران اشرف، مرجع سابق، ۳۹۳۔

اِس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ مؤیدینِ رنگ مشارکہ کے نزدیک امام الکاسانی (۵۸۷ھ) کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ سرمائے کی مقدار کے علم کو انتہائے شرکت تک مؤخر بھی کیا جا سکتا ہے اور اس سے پہلے اگرچہ سرمایہ نامعلوم رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ "نفع کی تقسیم کے وقت سرمایہ کی مقدار معلوم ہونی چاہیے" کے الفاظ سے ظاہر ہے اور نفع کی تقسیم شرکت کے اختتام پر ہی ہوتی ہے۔

اِس تناظر میں اگر امام الکاسانی (۵۸۷ھ) کی مندرجہ بالا عبارت کے الفاظ "وَقْتَ ال شرا فَيُعْلَمُ مِقْدَارُهَا" کو دیکھا جائے تو یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ احناف کے نزدیک سرمائے کی مقدار کا علم صرف انعقادِ شرکت کے لیے شرط نہیں ہے، لیکن شرکت کی عملاً ابتدا کے لیے سرمائے کی مقدار کا معلوم ہونا شرط ہے اور تب جا کر شرکت جائز متصور ہو گی۔ اسی لیے تو امام الکاسانی (۵۸۷ھ) نے وَقْتَ ال شرا کے الفاظ ذکر کیے۔ اُن کی عبارت سے واضح ہو جاتا ہے کہ سرمائے کی مقدار کے معلوم ہونے کا وقت "ابتدائے شرکت" ہے جس میں شرکتِ عقد کی پہلی خرید و فروخت کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس رنگ مشارکہ کے حامی اس وقت سے "تقسیم منافع سے قبل انتہائے شرکت کا وقت" مراد لیتے ہیں۔ نیز سرمائے کی مقدار کے معلوم ہونے کو وہ "صرف اتنی سی شرط" قرار دیتے ہوئے اُس کی اہمیت سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور اسی کو فقہائے احناف کا متفق علیہ موقف بتاتے ہیں، حالاں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

سرمائے کی مقدار سے متعلق حنفی فقہا کا متفق علیہ موقف

شرکا کے سرمائے کی مقدار کے معلوم ہونے سے متعلق حنفی فقہا کا متفق علیہ موقف کیا ہے؟ اس بارے میں یہاں چند جیّد حنفی فقہائے کرام کی عبارات پیش کی جا رہی ہیں۔ چناں چہ اس حوالے سے امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ (۴۸۳ھ)[۳۹] اپنا موقف یوں لکھتے ہیں:

۳۹۔ ابو بکر محمد بن ابو سہل ۴۰۰ھ/۱۰۱۰ء کو خراسان کے گاؤں سرخس میں پیدا ہوئے، ہے۔ شمس الائمہ سرخسی سے ملقب ہوئے۔ آپ نے شمس الائمہ عبد العزیز حلوانی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ حق گوئی اور بے باکی کی بدولت بادشاہ وقت نے خفگی میں آپ کو اوزجند میں ایک کنوئیں کے اندر قید کر دیا۔ آپ نے اپنے شاگردوں کو اسی کنویں سے اپنی تیس ضخیم جلدوں پر محیط کتاب المبسوط املا کرائی۔ اس کتاب کو فقہ حنفی کے مستند ماخذ میں شمار کیا جاتا ہے۔ امام سرخسیؒ ۴۸۳ھ کو دمشق میں فوت ہوئے۔ آپ کی تصنیفات میں المبسوط، شرح الجامع الكبير للإمام محمد، الأصول قابل ذکر ہیں۔ (الزرکلی، الأعلام، ۵:۳۱۵۔)

وَأَمَّا شَرِكَةُ الْعَنَانِ فَهُوَ أَنْ يَشْتَرِكَ الرَّجُلَانِ بِرَأْسِ مَالٍ يُحْضِرُهُ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا، وَلَا بُدَّ مِنْ ذَلِكَ، إِمَّا عِنْدَ الْعَقْدِ، أَوْ عِنْدَ ال شرا ......وَذَلِكَ كُلُّهُ فِي أَيْدِيهِمَا..... وَعِنْدَنَامُوجَبُ شَرِكَةِ الْعَقْدِ الْوَكَالَةُ عَلَى مَعْنَى أَنَّ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا يَكُونُ وَكِيلَ صَاحِبِهِ فِي ال شرا بِالْمَالِ الَّذِي عَيَّنَهُ؛ وَلِهَذَا شَرَطْنَا تَعْيِينَ الْمَالِ عِنْدَ الْعَقْدِ، أَوْ عِنْدَ ال شرا ؛ لِأَنَّ الْوَكَالَةَ بِال شرا بِمَالِهِ لَا تَصِحُّ إِلَّا بِهِ [۴۰]

شرکتِ عنان یہ ہے کہ دو لوگ سرمائے کے ساتھ باہم شریک ہوں اس طرح کہ ہر شریک اپنا سرمایہ حاضر کرے اور سرمائے کو عقد یا شرا کے وقت ہی حاضر کرنا ضروری ہے......اور سرمایہ ان دونوں کے ہاتھ میں موجود ہو.........اور ہمارے نزدیک وکالت شرکت عقد کا موجب ہوتی ہے وہ اس طرح کہ جو مال شرکا نے شرکت کے لیے متعیّن کیا ہوتا ہے اُس مال سے خریداری کرنے میں شریکین باہم ایک دوسرے کے وکیل ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم نے عقد یا خرید کے وقت مال متعیّن کرنے کی شرط لگائی کیوں کہ مال متعیّن کیے بغیر خریداری کے معاملے میں وکالت درست ہی نہیں ہوتی۔

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ (۴۸۳ھ) نے "وَلَا بُدَّ مِنْ ذَلِكَ"، "وَذَلِكَ كُلُّهُ فِي أَيْدِيهِمَا" اور "وَلِهَذَا شَرَطْنَا" کے الفاظ لکھ کر اس موقف کو مؤکد کر دیا کہ سرمایہ متعیّن کرنے کے لیے عقد یا شرا کے اوقات کے علاوہ کسی تیسری صورت کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ امام الکاسانی (۵۸۷ھ) خریداری کے وقت سرمایہ حاضر کرنے کے موقف کو ہی معتبر قرار دیتے ہیں: "وَإِنَّمَا يُشْتَرَطُ الْحُضُورُ عِنْدَ ال شرا لَا عِنْدَ الْعَقْدِ؛ لِأَنَّ عَقْدَ الشَّرِكَةِ يَتِمُّ بِال شرا فَيُعْتَبَرُ الْحُضُورُ عِنْدَهُ" [۴۱] (راس المال کا خریداری کے وقت حاضر کرنا ضروری ہے نہ کہ عقد کے وقت کیوں کہ عقدِ شرکت خریداری سے مکمل ہوتا ہے، پس خریداری کے وقت ہی سرمائے کا موجود کرنا معتبر ہوگا۔)

علامہ داماد آفندی رحمۃ اللہ علیہ (۱۰۷۸ھ)[۴۲] بھی اسی موقف کی تائید کرتے ہیں۔[۴۳] علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں: "لَا بُدَّ مِنْ كَوْنِهِ حَاضِرًا وَالْمُرَادُ حُضُورُهُ عِنْدَ عَقْدِ ال شرا لَا

۴۰۔ محمد بن احمد بن السرخسی (۴۸۳ھ)، **المبسوط**، (بیروت: دار المعرفة، ۱۹۹۳ء)، ۱۱: ۱۵۲۔

۴۱۔ الکاسانی، مصدر سابق، ۶: ۶۰۔

۴۲۔ آپ کا نام عبد الرحمن بن محمد ہے اور آپ شیخ زادہ اور داماد آفندی کے نام سے مشہور ہیں۔ اپنے وقت کے اجل حنفی فقیہ تھے۔ آپ کا تعلق ترکی سے تھا۔ آپ نے ۱۰۷۸ھ /۱۶۶۷ء کو وفات پائی۔ آپ کی تصنیفات میں **مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر**، **نظم الفرائد** اہم ہیں۔ (الزرکلی، مرجع سابق، ۳: ۳۳۲۔)

۴۳۔ عبد الرحمن بن محمد المعروف داماد آفندیؒ (۱۰۷۸ھ)، **مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر**، (دار إحياء التراث العربي)، ۱: ۷۱۸ (وَيُشْتَرَطُ حُضُورُ الْمَالِ عِنْدَ الْعَقْدِ أَوْ عِنْدَ الشِّرَاءِ لِأَنَّ الشَّرِكَةَ تَتِمُّ بِالشِّرَاءِ)۔

عِنْدَ عَقْدِ الشَّرِكَةِ"[۴۴] (شرکت کے درست ہونے کے لیے سرمائے کا حاضر ہونا ضروری ہے اور حاضر ہونے سے مراد عقدِ شرکت کی بجائے عقدِ شرا کے وقت سرمائے کا حاضر کرنا ہے)۔ عظیم حنفی امام ابو بکر علاؤالدین السمرقندی رحمۃ اللہ علیہ (۵۴۰ھ) اس بارے میں ہر قسم کے شک وشبہ کو دور کرتے ہوئے واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

وَأما الشّركَة بالأموال فلهَا شُرُوط عنانا كَانَت الشّركَة أَو مُفَاوَضَة مِنْهَا أَن يكون مَال الشّركَة حَاضرا إِمَّا عِنْد العقد أَو عِنْد ال شرا قَالُوا فِيمَن دفع إِلَى رجل ألف دِرْهَم وَقَالَ اخْرُج مثلهَا واشتر بهَا وبع فَمَا ربحت كَانَ بَيْننَا فَأخْرج ألفا وَاشْترى بهَا جَازَ وَإِن لم يُوجد المَال الْمعِين عِنْد العقد وَإِنَّمَا وجد عِنْد ال شرا وَإِنَّمَا كَانَ كَذَلِك لِأَن الشّركَة لَا تتمّ إِلَّا بِال شرا فوجود المَال عِنْده كوجوده فِي الِ ابتدا.[۴۵]

شرکت الاموال خواہ عنان ہو یا مفاوضہ اس کے جواز کی چند شرائط ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ شرکت کا سرمایہ عقد کے وقت یا خریداری کے وقت حاضر ہو۔ فقہا کے نزدیک ایسی شرکت جائز ہے کہ جس میں ایک آدمی دوسرے آدمی کو ایک ہزار روپے دیتے ہوئے کہے کہ تم بھی اتنے ہی اپنی طرف سے ملا لو اور ان سے خرید و فروخت کرو جو منافع ہوگا وہ ہمارے درمیان تقسیم ہوگا۔ وہ آدمی ہزار روپے لے کر چلا گیا اور خریداری کی۔ اگرچہ عقد کے وقت مال موجود نہ تھا تاہم خریداری کے وقت موجود تھا اور معاملہ ایسے ہی ہے کیوں کہ شرکت صرف خریداری سے ہی مکمل ہوتی ہے اور خریداری کے وقت سرمائے کو حاضر کرنا ایسے ہی جیسے شرکت کی ابتدا میں سرمایہ حاضر کیا گیا ہو۔

یعنی شرکت میں سرمائے کی مقدار کا تعیّن مشترکہ کاروبار کے لیے کی جانے والی "شرا" کے وقت ہو جانا لازمی ہے اور وہ کون سی "شرا" ہوگی؟ صاف ظاہر ہے مشترکہ کاروبار کی عملاً ابتداء کے وقت کی شرا ہوگی جیسا کہ امام سمرقندیؒ کی عبارت سے ظاہر ہے۔

امام السرخسی رحمۃ اللہ علیہ (۴۸۳ھ)، امام ابو بکر علاؤالدین السمرقندی رحمۃ اللہ علیہ (۵۴۰ھ)، امام الکاسانی رحمۃ اللہ علیہ (۵۸۷ھ)، علامہ داماد آفندی رحمۃ اللہ علیہ (۱۰۷۸ھ) اور علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۵۲ھ) جیسے جیّد فقہائے احناف کی مندرجہ بالا عبارات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شرکت الاموال میں سرمائے کو عملاً ابتدائے شرکت یعنی خریداری کے وقت حاضر کرنا شرکت کے درست ہونے کے لیے ضروری شرط ہے اور یہی احناف کا متفق علیہ موقف ہے۔ لہٰذا یہ ثابت ہو گیا کہ جس موقف کو حنفی فقہا کا متفق علیہ موقف بتانے کی کوشش کی گئی وہ

۴۴۔ ابن عابدین، مصدر سابق، ۴: ۳۱۱۔

۴۵۔ ابو بکر علاؤالدین السمرقندی (۵۴۰ھ)، **تحفة الفقهاء**، (بیروت: دار الکتب العلمية، ۱۹۹۴)، ۳: ۵۔

درحقیقت احناف کا موقف نہیں ہے۔ اِس لیے سرمائے کی مقدار معلوم ہونے کی لازمی شرط کو "صرف اتنی سی شرط" قرار دے کر صرفِ نظر کرتے ہوئے اُسے انتہائے شرکت تک مؤخر نہیں کیا جاسکتا۔

فقہائے احناف کی نسبت مالکی اور حنبلی فقہا تو سرمائے کی مقدار معلوم ہونے سے متعلق زیادہ سخت موقف رکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک سرمائے کی مقدار کا علم شرا کے وقت نہیں بلکہ شرکت کا عقد کرتے وقت ہونا ضروری ہے۔ عظیم حنبلی فقیہ امام ابن قدامہ حنبلیؒ (۶۲۰ھ)[۴۶] لکھتے ہیں:

وَلَا يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ رَأْسُ مَالِ الشَّرِكَةِ مَجْهُولًا، وَلَا جُزَافًا لِأَنَّهُ لَا بُدَّ مِنْ الرُّجُوعِ بِهِ عِنْدَ الْمُفَاصَلَةِ، وَلَا يُمْكِنُ مَعَ الْجَهْلِ وَالْجُزَافِ. وَلَا يَجُوزُ بِمَالٍ غَائِبٍ، وَلَا دَيْنٍ؛ لِأَنَّهُ لَا يُمْكِنُ التَّصَرُّفُ فِيهِ فِي الْحَالِ، وَهُوَ مَقْصُودُ الشَّرِكَةِ.[۴۷]

اور یہ جائز نہیں ہے کہ شرکت کا سرمایہ مجہول ہو اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ اس کا صرف اندازہ کر لیا جائے کیوں کہ (شرکت کی انتہا پر نفع کی تقسیم سے قبل) حساب کتاب کے وقت اصل سرمائے کا لوٹانا لازم ہوتا ہے اور یہ سرمائے کی جہالت یا سرمائے کے صرف اندازے کی صورت میں ممکن نہیں ہے اور شرکت غائب مال یا دَین پر بھی جائز نہیں ہے کیوں کہ اس صورت میں سرمائے پر فوری طور پر تصرف کرنا ممکن نہیں رہتا جب کہ شرکت کا مقصود ہی یہی ہے (کہ شرکت کے کاروبار کے لیے سرمائے میں تصرف کیا جائے۔

حالاں کہ حنبلی فقہا معاملات میں بہت زیادہ وسعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، اس کے باوجود وہ بھی یہاں توسع کے قائل نہیں۔ امام ابن قدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ (۶۲۰ھ) کے الفاظ "وَلَاجُزَافًا" سے رننگ مشارکہ کا تصور درست ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ رننگ مشارکہ میں انتہائے شرکت تک سرمائے کا صرف اندازہ ہی چل رہا ہوتا ہے اور حتمی مقدار کا علم صرف آخری دن میں جا کر ہوتا ہے۔ اسی تصور کو رد کرنے کے لیے ہی تو فقہا نے سرمائے کو شرا کے وقت یا عقد کے وقت موجود کرنے کی شرط لگائی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فقہائے احناف اور

۴۶۔ عبد اللہ بن احمد بن قدامہ ۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء کو فلسطین کے شہر نابلس میں واقع گاؤں جماعیل میں پیدا ہوئے۔ ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء کو حصول علم کے لیے دمشق چلے گئے۔ آپ نے بغداد میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (۵۶۱ھ) سے اکتساب فیض کیا۔ کچھ عرصہ مکہ مکرمہ میں مبارک بن علی بن الطبّاخ الحنبلی سے فقہ پڑھی اور پھر واپس بغداد آگئے پھر کچھ عرصہ بعد دمشق چلے گئے، جہاں اپنی کمال تصنیف المغنی کی تالیف میں مصروف ہوگئے۔ آپ نے ۷۹ سال کی عمر میں ۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء کو دمشق میں اِنتقال کیا۔ آپ کی تصنیفات میں المغني، روضة الناظر، المقنع، الكافي، الاستبصار في نسب الأنصار قابل ذکر ہیں۔ (الزرکلی، مرجع سابق، ۴: ۶۷۔)

۴۷۔ عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ (۶۲۰ھ)، المغني (قاہرہ: مكتبة القاهرة، ۱۹۶۸ء)، ۵: ۱۴۔

دیگر فقہا سرمائے کو شرا کے وقت یا عقد کے وقت موجود کرنے کی شرط کیوں لگاتے ہیں؟ اس کا جواب امام الکا سانی رحمۃ اللہ علیہ (۵۸۷ھ) اورامام ابن القدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ (۶۲۰ھ) کی مندرجہ بالا عبارات میں بالترتیب فَيُعْلَمُ مِقْدَارُهَا اور مَجْهُولًا وَلَا جُزَافًا کے الفاظ میں موجود ہے۔

رنگ مشارکہ کی ابتداء میں شرح منافع کا متعیّن نہ ہونا

یہ بات طے ہو جانے کے بعد کہ سرمائے کو شرا کے وقت یا عقد کے وقت موجود کرنا اس لیے لازمی ہے تا کہ سرمائے کی مقدار متعیّن ہو جائے کہ کس شریک کا سرمایہ کتنا ہے۔اس کے بعد ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرمائے کی مقدار کا یہ تعیّن کیوں ضروری ہے؟ اس کا جواب بھی امام الکاسانی رحمۃ اللہ علیہ (۵۸۷ھ) اورامام ابن القدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ (۶۲۰ھ) کی عبارات میں بالترتیب "فَلَا يُؤَدِّي إِلَى جَهَالَةِ مِقْدَارِ الرِّبْحِ" اور "لِأَنَّهُ لَا بُدَّ مِنْ الرُّجُوعِ بِهِ عِنْدَ الْمُفَاصَلَةِ" کے الفاظ میں موجود ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ سرمائے کی مقدار معلوم ہوگی تبھی تو اُسے شرکت کے اختتام پر الْمُفَاصَلَة یعنی حساب کتاب کے وقت کاروبار کی کل رقم سے سرمائے کی وہ متعیّن مقدار الگ کر کے سرمایہ داروں کو واپس کی جائے گی اور اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ اگر کچھ رقم بچ گئی ہے تو وہ منافع ہے جو شرکا میں تقسیم کیا جائے گا۔ لیکن اگر شرکا کا سرمایہ متعین اور معلوم ہی نہیں ہوگا تو یہ کیسے پتا چلے گا کہ کس شریک کا سرمایہ کتنا ہے اس طرح یہ بھی معلوم نہیں ہوسکے گا کہ کاروبار میں کل نفع کتنا ہوا ہے یا نفع ہوا بھی ہے یا نہیں یا نقصان ہوا ہے، جیسا کہ امام السرخسی رحمۃ اللہ علیہ (۴۸۳ھ) لکھتے ہیں: "ثُمَّ يُبَيِّنُ مِقْدَارَ رَأْسِ مَالِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا لِأَنَّ عِنْدَ الْقِسْمَةِ لَا بُدَّ مِنْ تَحْصِيلِ رَأْسِ مَالِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا؛ لِيَظْهَرَ الرِّبْحُ"[۴۸]

(پھر) ہر شریک اپنے اپنے سرمائے کی مقدار بیان کرے کیوں کہ منافع کی تقسیم کے وقت (کاروبار کی مجموعی رقم میں) سب سے پہلے اُن کے بنیادی سرمائے نکالنا لازمی ہے تا کہ حتمی نفع سامنے آسکے۔)

اس جگہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "شرح منافع کی تعیین" میں "سرمائے کی مقدار کے معلوم" ہونے کا کیا کردار ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سرمائے کی مقدار کا معلوم ہونا شرح منافع کی تعیین کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔کاروبار کے کل منافع میں کس شریک کا حصہ کتنا ہوگا اس کا انحصار ہر شریک کے سرمائے کی مقدار پر

۴۸- السرخسی (۴۸۳ھ)، المبسوط، ۱۱: ۱۵۶۔

ہو گا۔ کیوں کہ جب سرمائے کی مقدار نامعلوم ہو گی تو سرمائے کا تناسب بھی نامعلوم رہے گا جس کا بدیہی نتیجہ شرح منافع کی جہالت کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس لیے ''شرح منافع کی تعیین'' میں ''سرمائے کی مقدار کے معلوم'' ہونے کا بنیادی کردار ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کون سا شریک منافع میں سے کتنا حصہ لے گا؟ تو اس کا انحصار ہر شریک کی حیثیت پر ہوتا ہے۔ اگر سب کے سب شرکا فعّال ہیں تو وہ اپنے اپنے سرمائے کے تناسب سے نفع وصول کریں گے اور اگر ان میں کوئی شریک زیادہ تجربہ کار، محنتی، باصلاحیت ہے تو شرکا کی باہم رضامندی سے اُس کا حصہ اُس کے سرمائے کے تناسب سے زیادہ بھی مقرر کیا جاسکتا ہے[۴۹] اور اگر مشترکہ کاروبار میں کوئی غیر فعّال شریک ہے تو اس کا نفع زیادہ سے زیادہ اُس کے سرمائے کے تناسب کے برابر مقرر کیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے زیادہ نہیں ورنہ شرکت فاسد ہو جائے گی۔

اس طرح یہ بات اب واضح ہو جانی چاہیے کہ جب تک شرکا کے سرمائے کی مقدار معلوم نہیں ہو گی تو اُن کے سرمائے کا تناسب مجہول رہے گا اور تناسب کی جہالت شرح منافع کی تعیین میں مانع ہو گی اور ایسی جہالت شرکا کے مابین نزاع کا سبب بننے کے باعث مفسدِ شرکت ہے، جیسا کہ امام الکاسانی (۵۸۷ھ) لکھتے ہیں: ''أَنْ يَكُونَ الرِّبْحُ مَعْلُومَ الْقَدْرِ، فَإِنْ كَانَ مَجْهُولًا تَفْسُدُ الشَّرِكَةُ؛ لِأَنَّ الرِّبْحَ هُوَ الْمَعْقُودُ عَلَيْهِ، وَجَهَالَتُهُ تُوجِبُ فَسَادَ الْعَقْدِ'' [۵۰] (منافع کی شرح معلوم ہونی چاہیے، اگر یہ مجہول ہوئی تو شرکت فاسد ہو گی، کیوں کہ (شرکت کے عقد میں) منافع ہی معقود علیہ ہوتا ہے اور معقود علیہ کی جہالت عقد کے فساد کا سبب بنتی ہے۔)

فتاویٰ عالمگیری میں بھی اسی پر فتوی دیا گیا ہے کہ شرکت کے عقد میں منافع کی تعیین لازمی ہے ورنہ شرکت فاسد ہو گی۔[۵۱] وہبہ زحیلی (۲۰۱۵) امام الکاسانیؒ کی بات کو قدرے وضاحت کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں: ''تكُوْنُ حِصَّةُ كُلِّ شَرِيكٍ مِّنَ الرِّبْحِ نِسْبَةً مَعلُوْمَةً مِّنْهُ، كَخَمْسِه أَو ثُلُثِه أو عَشَرةٍ فِي المِئَةِ، فَإِن كَانَ الرِّبْحُ مَجْهُوْلاً تَفسُدُ الشَّرْكَةُ؛ لِأَنَّ الرِّبْحَ هُوَ الْمَعْقُوْدُ عَلَيْهِ وجَهالَةُ الْمَعْقُودِ عَلَيْهِ تَسْتَوْجِبُ فَسَادَ العَقْدِ.'' (شرکت کے نفع میں ہر شریک کے نفع کا تناسب معلوم ہو جیسے کل نفع کا پانچواں

۴۹۔ **الفتاوى الهندية** (بيروت: دار الفكر، ۱۳۱۰ھ)، ۲: ۳۲۰۔

۵۰۔ الکاسانیؒ، مرجع سابق، ۶: ۵۹۔

۵۱۔ **الفتاوى الهندية**، ۲: ۳۰۲۔

حصہ یا تیسرا حصہ یا نفع میں دس فیصد۔ اگر شرح منافع مجہول رہی تو اس سے شرکت فاسد ہو جائے گی۔ کیوں کہ شرکت میں منافع ہی معقود علیہ ہوتا ہے اور معقود علیہ کی جہالت عقد کے فساد کا سبب بنتی ہے۔)

اب سوال یہ ہے کہ کیا شرکت کی ابتدا میں شرح منافع متعیّن کرنا ضروری ہے یا اسے انتہاے شرکت تک مؤخر بھی کیا جاسکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شرح منافع کے تعیّن کا انحصار سرمائے کے تناسب پر ہوتا ہے، جس وقت سرمائے کا تناسب معلوم ہوگا تو شرح منافع بھی اسی وقت متعین ہوگی۔ گویا سرمائے کا تناسب شرح منافع کی تعیین کے لیے لازم ہے اور اس طرح دونوں میں لازم وملزوم کی نسبت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اِس قاعدے كُلَّمَا وُجِدَ اللَّازِمُ وُجِدَ الْمَلْزُومُ [۵۲] (جب لازم پایا جائے گا تو ملزوم بھی پایا جائے گا) کے تحت یہ کہا جاسکتا ہے کہ لازم کا محل ہی ملزوم کا محل ہوگا اور وہ ابتدائے عقد ہے نہ کہ انتہاے عقد۔ اس لیے شرکت کی ابتدا میں ہی شرح منافع متعیّن کرنا ضروری ہے اور اسے انتہاے شرکت تک مؤخر نہیں کیا جاسکتا۔ جدید اسلامی مالیاتی اداروں اور اسلامی بینکوں کے معاملات سے متعلق معیار بنانے والے ادارے هيئة المحاسبة والمراجعة للمؤسسات المالية الإسلامية [۵۳] کے المعايير الشرعيه میں بھی تقریباً سارے معاییر میں کلاسیکل فقہ کی بنسبت بہت ہی

۵۲- ابو مصطفی البغدادی (۲۰۱۲ء)، **الواضح في المنطق: شرح وتوضيح على متن إيساغوجي**، ۲۲؛ عبدالرحمن بن احمد الایجی (۷۵۶ھ)، **المواقف**، (بیروت: عالم الكتب)، ۳۶ (**الواضح في المنطق** اس لنک سے ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے: (http://www.mediafire.com/?3kwpwsusae4vh2e)

۵۳- اسلامی سلطنت بحرین میں ۲۶ فروری ۱۹۹۰ء کو اس ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔ انگلش میں اسے (Accounting and Auditing Organization for Islamic Financial Institutions) کہا جاتا ہے، جسے مختصراً ایوفی (AAOIFI) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس ادارے میں مذاہبِ اربعہ (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) کے ۲۰۰ علماء اور سکالرز ممبر ہیں جو جدید تعلیم اور تحقیق کے جدید طرق سے بہرہ ور ہیں۔ اس ادارے کے اجلاس سہ ماہی، شش ماہی اور سالانہ بنیادوں پر منعقد ہوتے ہیں، جن میں عصر حاضر کے جدید معاشی وحسابی مسائل کے اسلامی حل کے لئے غور وفکر کیا جاتا ہے۔ اِجلاس میں تحقیقی مقالہ جات پڑھے جاتے ہیں، جن میں پیش کردہ تعبیرات وتوجیہات پر جرح کے بعد اُن مقالات کو متعلقہ معاشی وحسابی مسائل کے شرعی حل کے طور پر اتفاق رائے سے قبول یا مسترد کیا جاتا ہے۔ یہ ادارہ متفقہ طور پر پاس ہونے والے شرعی حل کو فقہی قانون کی شکل دے کر ہر سال معاشی مسائل سے متعلقہ قوانین کو **المعايير الشرعية** کے نام سے عربی میں شائع کرتا ہے، اور کچھ عرصے کے بعد انگریزی میں ترجمہ کر کے اسے *(Shariah Standards)* کے نام سے شائع کرتا ہے اور حسابی مسائل کو **المعايير المحاسبة و المراجع** *(Accounting, Auditing and Governance Standards)* کے نام سے شائع کرتا ہے، اس کو بھی عربی اور انگریزی میں شائع کیا جاتا ہے۔

زیادہ وسعت کے پیش نظر فیصلے دیے گئے ہیں۔ اتنی وسعت کے باوجود المعاییر الشرعیہ میں شرح منافع کی تعیین سے متعلق کسی قسم کی تاخیر کو قبول نہیں کیا گیا؛ "لا يجوز تأجيل تحديد نسب الأرباح لأطراف الشركة إلى ما بعد حصول الربح، بل يجب تحديدها عند إبرام الشركة"[۵۴] (شرکا کے لیے شرح منافع کی تعیین کو حصولِ منافع کے بعد کی مدت تک مؤخر کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ شرکت کا عقد کرتے وقت شرح منافع کا تعیّن کرناواجب ہے۔)

المعاییر الشرعیہ میں "لا يجوز تأجيل تحديد" اور "بل يجب تحديدها" کے الفاظ نہایت ہی اہمیت کے حامل ہیں جس سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی بینکوں کے رننگ مشارکہ میں شرح منافع کی تعیین کو "إلى ما بعد حصول الربح" تک مؤخر کیا جانا جائز نہیں ہے۔ اگر اس بارے میں شرع میں کسی قسم کی کوئی گنجائش ہوتی تو کلاسیکل فقہا نہ سہی جدید فقہا ہی اس بارے میں کوئی اجازت دے دیتے۔ المعاییر الشرعیہ میں بھی تعیین منافع کو مؤخر کرنے کی اجازت کا نہ دیا جانا اہل عقل و دانش کے لیے ایک پیغام رکھتا ہے۔

رننگ مشارکہ میں غرر کثیر کا پایا جانا

رننگ مشارکہ میں سرمائے کی مقدار اور شرح منافع کا تعیّن ابتدائے عقد میں مجہول رہتے ہیں کیوں کہ ابتدا میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ منافع کی تقسیم سرمائے کی نسبت سے ہو گی لیکن اُس وقت نہ تو سرمایہ معلوم و متعین ہوتا ہے اور نہ ہی منافع۔ عملاً یہ تعیین انتہائے شرکت تک مؤخر ہوتی ہے۔ حالاں کہ رننگ مشارکہ پر شرکتِ عنان کے احکام صادر ہوتے ہیں۔ اس لیے رننگ مشارکہ کے درست ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں سرمائے کی مقدار اور شرح منافع کا تعیّن ابتدائے عقد میں ہو ورنہ بنیادی اصولوں کی مخالفت کی بنا پر رننگ مشارکہ ایک فاسد عقد قرار پائے گا۔ نیز اگر سرمائے کی مقدار اور شرح منافع کی تعیین کو انتہائے شرکت تک مؤخر کر دیتے ہیں تو اس معاملے میں ابتدا تا انتہا غرر لازم آتا ہے اور یوں تکمیل کے مرحلے تک معاملہ الجھا ہوا رہتا ہے کہ خبر نہیں سرمائے کی مقدار کیا بنے گی اور اس کی بنا پر منافع کیا ہو گا؟ یہ ایسا غرر ہے جسے غرر کثیر کہا جاتا ہے۔ علامہ

۵۴- المعاییر الشرعیۃ (هيئة المحاسبة والمراجعة للمؤسسات المالية الإسلامية، ۲۰۱۰ء)، رقم المعيار (۱۲)، الشركة (المشاركة) والشركات الحديثة، دفعہ نمبر: ۳/ ۱/ ۵/ ۲۔

باجی رحمۃ اللہ علیہ (۴۷۴ھ)[۵۵] فرماتے ہیں: غرر کثیر وہ ہے جو عقد میں غالب آجائے یہاں تک عقد اس غرر کے ساتھ ہی متصف ہو۔[۵۶] اور غرر یسیر کے بارے میں علامہ الدسوقی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۳۰ھ)[۵۷] فرماتے ہیں: "غَرَرٌ يَسِيرٌ أَيْ وَهُوَ مَا شَأْنُ النَّاسِ التَّسَامُحُ فِيهِ"[۵۸] (غرر یسیر وہ ہے جس میں لوگ عام طور پر تسامح سے کام لیتے ہوں)۔ رنگ مشارکہ کے معاملے کو دیکھا جائے تو اس میں انتہاے عقد تک غرر غالب رہتا ہے اور یہ ایسا غرر ہے کہ جس میں لوگ عموماً تسامح سے کام نہیں لیتے کیوں کہ لوگ عُرف عام میں بھی شراکت کرتے وقت سرمائے کی مقدار اور شرح منافع کا تعیّن پہلے سے کرتے ہیں۔ لہٰذا رنگ مشارکہ میں سرمائے کی مقدار اور منافع یعنی معقود علیہ دونوں کے متعلق غرر پایا جارہا ہے جو کہ غرر کثیر ہے۔ جس عقد میں غرر کثیر پایا جاتا ہے وہ عقد ناجائز ہو جاتا ہے جیسا کہ علامہ ابن رُشدؒ مالکی (۵۹۵ھ) فرماتے ہیں: فقہاے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ اگر مبیع (معقود علیہ)[۵۹] کے

۵۵- سلیمان بن خلف الباجی ھ / ۱۰۱۲م کو اندلس کے شہر بَاجَة میں پیدا ہوئے۔ آپ فقی مالکی کی قابل فقیہ تھے۔ بغداد میں تین اور موصل میں ایک سال قیام کیا۔ دمشق اور حلب میں ایک عرصہ مقیم رہے۔ پھر بالآخر اندلس واپس لوٹ گئے۔ آپ قاضی کے منصب پر بھی فائز رہے۔ آپ نے ۴۷۴ھ / ۱۰۸۱م کو اندلس کے شہر المرية میں انتقال کیا۔ آپ کی تصنیفات میں **السراج في علم الحجاج، إحكام الفصول في أحكام الأصول، المنتقى** قابل ذکر ہیں۔ (الزرکلی، مرجع سابق، ۳: ۱۲۵۔)

۵۶- قاضی سلیمان بن خلف الباجی (۴۷۴ھ)، **المنتقى شرح الموطأ**، (مصر: مطبعة السعادة، ۱۳۳۲ھ)، ۵: ۴۱ (مَا كَثُرَ فِيهِ الْغَرَرُ، وَغَلَبَ عَلَيْهِ حَتَّى صَارَ الْبَيْعُ يُوصَفُ بِبَيْعِ الْغَرَرِ فَهَذَا الَّذِي لَا خِلَافَ فِي الْمَنْعِ مِنْهُ)

۵۷- محمد بن احمد بن عرفہ دُسوقی مالکی مصر کے ایک گاؤں دُسوق میں پیدا ہوئے۔ آپ مختلف علوم: الفقه والكلام والنحو والبلاغة والمنطق والهيئة والهندسة والتوقيت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ علوم کے حصول کے لیے قاہرہ آئے۔ جامعہ الازہر سے تعلیم حاصل کی۔ آپ نے ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۵م کو قاہرہ میں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف میں **الحدود الفقهية، حاشية على مغني اللبيب، حاشية على شرح السنوسي لمقدمة أم البراهين** قابل ذکر ہیں۔ (الزرکلی، مرجع سابق، ۱: ۶۶۔)

۵۸- محمد بن احمد الدسوقی (۱۲۳۰ھ)، **حاشية الدسوقي على الشرح الكبير** (بیروت: دار الفکر)، ۳: ۶۰۔

۵۹- مبیع کا معنی معقود علیہ اس لیے کیا تاکہ شرکت کے معقود علیہ (منافع) کا معنی اسی کے تحت آجائے کیوں کہ فقہا کے نزدیک شرکت بھی درحقیقت بیع ہی ہے جیسا کہ علامہ ابن رُشد لکھتے ہیں: وَإِنْ كَانَتْ فِي الْحَقِيقَةِ بَيْعًا (اگرچہ شرکت حقیقت میں بیع ہے)۔ (ابن رشد، **بداية المجتهد ونهاية المقتصد**، ۴: ۳۵۔)

اندر پایا جانے والا غرر کثیر ہو تو وہ ناجائز ہے۔[۶۰] رنگ مشارکہ کے موجودہ ڈھانچے میں اگر غرر کو انتہاے عقد تک گوارا کیا جاسکتا ہے تو پھر بیع المعدوم میں بھی انتہاے عقد تک غرر کو برداشت کیا جانا چاہیے تھا کہ عقد کے آخر میں معقود علیہ حاضر کر دی جائے گی جس سے غرر ختم ہو جائے گا اور معاملہ درست رہے گا۔ لیکن کیا شرع نے اس کا اعتبار کیا؟ اس بارے میں جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب بھی تحریر کرتے ہیں: ”شرکا میں تقسیم ہونے والے منافع کی شرح معاہدے کے نافذ العمل ہونے کے وقت طے ہو جانی چاہیے۔ اگر اس طرح شرح منافع طے نہ کی گئی تو عقد شرعاً درست نہیں ہو گا۔“[۶۱]

عین ممکن ہے کہ رنگ مشارکہ کے مجوّزین کی جانب سے کہا جائے کہ شرکت عقد کا معقود علیہ منافع نہیں ہوتا بلکہ شرکت کا سرمایہ ہوتا ہے جیسا کہ امام برہان الدین المرغینانی (۵۹۳ھ) لکھتے ہیں: ”لِأَنَّ الْمَعْقُودَ عَلَيْهِ فِي عَقْدِ الشَّرِكَةِ الْمَالُ“[۶۲] (شرکت عقد میں مال معقود علیہ ہوتا ہے)۔ لہٰذا منافع کی جہالت معقود علیہ کی جہالت کو مستلزم نہیں ہوتی اور عقد درست رہتا ہے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ امام امام برہان الدین المرغینانی (۵۹۳ھ) کی اسی عبارت میں وَبِهَلَاكِ الْمَعْقُودِ عَلَيْهِ يَبْطُلُ الْعَقْدُ كَمَا فِي الْبَيْعِ[۶۳] کا قول بھی موجود ہے یعنی اگر معقود علیہ ہلاک ہو جائے تو شرکت بھی باطل ہو جاتی ہے۔ کیا رنگ مشارکہ میں اس بات کیا خیال کیا جاتا ہے کہ اگر کلائنٹ سے رنگ مشارکہ کا سرمایہ ہلاک ہو جائے تو اس سے شرکت باطل ہو جائے گی؟ مثال کے طور پر کلائنٹ اسلامی بینک سے شرکت کا سرمایہ لے کر نکلا کسی اچانک حادثے کی بدولت وہ رقم ہلاک ہو گئی اور اس حادثے میں کلائنٹ کی تعدی بھی ثابت نہ ہو تو کیا اسلامی بینک اس نقصان کی ذمہ داری برداشت کرے گا یا مکمل ضمان کلائنٹ پر آئے گا؟ اسلامی بینک عموماً کلائنٹ کو ہی ضامن ٹھہرائے گا جو کہ ناجائز ہے۔

۶۰- محمد بن احمد المعروف بابن رشد الحفیدؒ (۵۹۵ھ)، **بداية المجتهد ونهاية المقتصد** (قاہرہ: دار الحدیث، ۲۰۰۴ء)، ۳: ۱۷۳ (الْفُقَهَاءُ مُتَّفِقُونَ عَلَى أَنَّ الْغَرَرَ الْكَثِيرَ فِي الْمَبِيعَاتِ لَا يَجُوزُ)

۶۱- محمد تقی عثمانی، مرجع سابق، ۵: ۳۱۔

۶۲- المرغینانی، مصدر سابق، ۳: ۱۰۔

۶۳- نفس مصدر۔

اسلامک بینکنگ ڈپازٹس اور رننگ مشارکہ: سرمائے کی حتمی مقداراورشرح منافع کی عدمِ تعیین

رننگ مشارکہ کے حامی احباب کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ رننگ مشارکہ میں یومیہ پیداوار کی بنیاد (Daily product basis) اس بات کی متقاضی ہے کہ اس میں سرمائے کا تعیّن انتہاے عقد تک مؤخر کیا جائے اور یہ ایک مجبوری ہے۔ وہ اس بارے میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر یومیہ پیداوار کی بنیاد کو قبول نہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ کوئی شریک مشترکہ حوض سے نہ رقم نکلوا سکتا ہے اور نہ ہی اس میں نئی رقم شامل کر سکتا ہے۔ اس طرح کوئی شخص اس وقت تک نئی سرمایہ کاری کرنے کے قابل بھی نہیں ہو گا جب تک کہ نئی مدت کی متعیّن تاریخ نہ آجائے۔ بینکوں کی کھاتہ داروں کی جہت سے (Deposit Side) جہاں کھاتہ دار روزانہ کئی مرتبہ رقم جمع کرواتے اور نکلواتے ہیں، یہ طریق کار بالکل ناقابل عمل ہے۔ یومیہ پیداوار کے تصور کو رد کر دینے کی وجہ سے یہ کھاتہ دار اس بات پر مجبور ہوں گے کہ اپنی بچی ہوئی رقم کو کسی نفع بخش اکاؤنٹ میں جمع کرانے سے پہلے کئی ماہ انتظار کریں، اس طرح تو اسلامی بینکوں کا ڈپازٹس کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔[۶۴]

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ رننگ مشارکہ میں پائی جانے والی مشکلات کو مضاربہ ڈپازٹس میں پائی جانے والی مشکلات پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ کیوں کہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی جانب سے IDB Circular No. 03 of 2012 کے تحت مضاربہ ڈپازٹس میں کلائنٹ کے سرمائے کی مقدار کی حتمی تعیین کو انتہاے عقد تک مؤخر کرنے کی اجازت صرف اس شرط پر دی گئی تھی کہ تمام اسلامی بینک تین دن پہلے ہی اپنی ویب سائیٹس پر یہ معلومات فراہم کریں گے کہ مضاربہ ڈپازٹس سے حاصل ہونے والے منافع میں اسلامی بینک اور مضاربہ پول کا شیئر کتنا ہو گا، نیز مضاربہ پول میں موجود کلائنٹس کے لیے ویٹیج کیا ہو گی۔[۶۵] ڈیلی پروڈکٹ کے حساب سے منافع کی تقسیم صرف اسی صورت میں ممکن تھی کہ سرمائے کے مقدار کی حتمی تعیین انتہاے عقد تک مؤخر کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ فقہانے خلافِ قیاس استحساناً اس کی اجازت دی، لیکن فقہانے یہ اجازت دیتے وقت یہ ضرور پیشِ نظر رکھا کہ کہیں اس اجازت کی آڑ میں منافع کی تعیین کو بھی مؤخر تو نہیں کیا جا رہا۔ جب یہ

۶۴- محمد تقی عثمانی، مرجع سابق، ۵: ۶۱-

65- State Bank of Pakistan, IDB Circular No. 03 of 2012, *Instructions for Profit & Loss Distribution and Pool Management for Islamic Banking Institutions*, 3-4.

یقین ہو چکا کہ اسلامی بینک شرح منافع اور ویٹیج کا تعیّن ابتدا میں کر دیتے ہیں تو پھر جا کر استحساناً یہ اجازت دے دی گئی۔

رننگ مشارکہ میں ڈیلی پروڈکٹ بیسز کو بنیاد بنانا تب درست ہوتا اگر مضاربہ ڈپازٹس کی طرح رننگ مشارکہ میں بھی ابتدا ہی سے اسلامی بینک اور کلائنٹ کے مابین منافع کی واضح نسبتوں کو اُن کی ویب سائٹس پر یا کسی بھی قانونی دستاویز پر تحریراً لکھ دیا جاتا۔ لیکن رننگ مشارکہ میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ نیز مضاربہ میں سرمائے کی تعیین کو انتہاے عقد تک مؤخر کرنے کی یہ اجازت شرح منافع کی تعیین میں جہالت کا سبب نہیں بنتی اور شرح منافع کی خاص نسبتیں واضح طور پر عقد کی ابتدا میں متعین ہو جاتی ہیں۔ جب کہ مشارکہ میں یہ تاخیر شرح منافع کی تعیین میں جہالت کو مستلزم ہے اور یہ ایک قاعدہ ہے: "إِذَا انْتَفَى اللَّازِمُ انْتَفَى الْمَلْزُومُ"[٦٦] (جب لازم نہیں پایا جائے گا تو ملزوم بھی نہیں پایا جائے گا)۔ یعنی سرمایہ مجہول ہوگا تو شرح منافع بھی مجہول رہے گی، کیوں کہ مشارکہ میں شرح منافع کا تعیّن سرمائے کے تناسب پر منحصر ہوتا ہے۔ جب کہ مضاربہ میں شرح منافع کی تعیین کا انحصار مضاربہ کے سرمائے پر نہیں ہوتا بلکہ رب المال اور مضارب کی باہم رضامندی پر ہوتا ہے۔ اس لیے مضاربہ ڈپازٹس کی مجبوریوں کو رننگ مشارکہ کے جواز کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ نیز مضاربہ میں سرمائے کی مقدار کے حتمی تعیّن کو مؤخر کرنے کی اجازت از خود ایک خلاف قیاس امر ہے اور یہ ایک مسلمہ اصول ہے: "وَمَا ثَبَتَ بِخِلَافِ الْقِيَاسِ يَقْتَصِرُ فِيهِ عَلَى مَوْرِدِ النَّصِّ"[٦٧] (جو امر خلاف قیاس ثابت ہو وہ اپنے موردِ نص تک ہی محدود ہوتا ہے) یعنی اس پر مزید قیاس کرتے ہوئے کسی اور معاملے کے لیے جواز کی دلیل نہیں نکالی جاسکتی۔ اس لیے یہاں رننگ مشارکہ میں سرمائے کی مقدار کی تعیین کو مؤخر کرنے کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

اسلامی بینک اور کلائنٹ کے سرمائے کی نوعیت

رننگ مشارکہ میں اسلامی بینک کا سرمایہ نقدی کی صورت میں ہوتا ہے جب کہ کلائنٹ کی جانب سے مخلوط سرمایہ ہوتا ہے جو نقدی، قابل وصول دیون اور مختلف سامان کی صورت میں مخلوط ہوتا ہے۔ یعنی شریکین کا سرمایہ مختلف نوعیت کا ہوتا ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسی شرکت جائز ہے؟

٦٦- شمس الدین الاصفہانی(۷۴۹ھ)، بيان المختصر شرح مختصر ابن الحاجب (سعودی عرب: دارالمدني، ۱۴۰۶ھ)، ۳: ۲۳۲۔

٦٧- ابن الہمام، مصدر سابق، ۸: ۳۶۔

سرمایہ کا نقدی ہونا

شرکت العقد میں شریکین کا سرمایہ اگر نقدی کی صورت میں ہو تو حنفی،[۶۸] مالکی[۶۹] اور حنبلی[۷۰] فقہا کے نزدیک یہی سب سے بہتر ہے اور سرمائے کا باہم اختلاط بھی لازمی نہیں ہے، تاہم شوافع کے نزدیک سرمائے کا باہم اختلاط اس طرح ہو کہ اُن کے اموال میں امتیاز باقی نہ رہے، ورنہ سرے سے شرکت منعقد ہی نہیں ہوگی۔[۷۱] فقہا جہاں مال کے اختلاط کو لازمی شرط قرار نہیں دیتے وہیں وہ یہ تصریح بھی کرتے ہیں کہ اگر شرکا کے سرمائے مخلوط ہونے سے قبل کسی شریک کا مال ضائع ہو گیا تو وہ نقصان صرف اُسی شریک کا ہی ہو گا اور دوسرے شرکا اس نقصان میں شریک نہیں ہوں گے۔ لیکن اگر اختلاط کے بعد کسی ایک کے مال سے خریداری کرنے کے بعد دوسرے کا سرمایہ ضائع تو اس نقصان میں سب شرکا شریک ہوں گے۔[۷۲] تاہم اگر شرکا کے سرمائے مخلوط نہ ہوئے ہوں اور کسی کے مال سے شرکت کی خریداری بھی ابھی تک نہ کی گئی ہو اور کسی شریک کا سرمایہ اُس کے اپنے ہاتھ سے یا دوسرے شریک کے ہاتھ سے ہلاک ہو جائے تو یہ نقصان صرف ہلاک شدہ مال کے مالک کا ہی ہو گا، کیوں کہ شریک کے ہاتھ میں دوسرے شریک کا سرمایہ امانت ہوتا ہے اور اگر اس میں امین کی تعدی نہ پائی جائے تو وہ ضامن بھی نہیں ہوتا، جیسا کہ محقق علی الاطلاق امام ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ (۸۶۱ھ) فرماتے ہیں: "لَوْ هَلَكَ أَحَدُ الْمَالَيْنِ قَبْلَ الْخَلْطِ وَقَبْلَ ال شرا يَهْلِكُ مِنْ مَالِ صَاحِبِهِ وَحْدِه سَوَاءٌ هَلَكَ فِي يَدِ مَالِكِهِ أَوْ يَدِ شَرِيكِهِ؛ لِأَنَّهُ أَمَانَةٌ فِي يَدِهِ بِخِلَافِ مَا بَعْدَ الْخَلْطِ حَيْثُ يَهْلِكُ عَلَيْهِمَا لِعَدَمِ التَّمْيِيزِ فَتَبْطُلُ الشَّرِكَةُ"[۷۳] (اگر باہم مخلوط ہونے اور خریداری کرنے سے قبل کسی ایک شریک کا مال خواہ اس کے اپنے ہاتھ سے یا اُس کے شریک کے ہاتھ سے ہلاک ہو جائے تو وہ نقصان صرف ہلاک شدہ مال کے مالک کا ہی ہو گا، کیوں کہ وہ مال

۶۸۔ السرخسی، مصدر سابق، ۱۱: ۱۵۲۔

۶۹۔ مالک بن انس (۱۷۹ھ)، **المدونة**، (بیروت: دار الكتب العلمية، ۱۹۹۴ء)، ۳: ۶۱۴۔

۷۰۔ ابو محمد موفق الدین المعروف بابن قدامہ، **المغني** (قاہرہ: مكتبة القاهرة، ۱۹۶۸)، ۵: ۱۴۔

۷۱۔ یحیٰ بن شرف النووی (۶۷۶ھ)، **روضة الطالبين وعمدة المفتين** (بیروت: المكتب الإسلامي، ۱۹۹۱ء)، ۴: ۲۷۷۔

۷۲۔ الزحیلی، مصدر سابق، ۵: ۵۶۰۔

۷۳۔ ابن الہمام، مصدر سابق، ۸: ۳۶۔

دوسرے شریک کے ہاتھ میں امانت کے طور پر تھا۔ لیکن اگر مخلوط ہونے بعد ہلاک ہوتا تو وہ دونوں کا نقصان ہوتا کیوں کہ اس صورت میں ان کے اموال میں فرق کرنا ممکن نہ ہوتا۔ لہذا سرمائے کے ہلاک ہونے کے سبب شرکت باطل ہو جاتی ہے۔)

رننگ مشارکہ کی صورت میں اسلامی بینک اور کلائنٹ دونوں کے سرمائے کو بالفرض اگر نقدی صورت میں تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی اس بارے میں شکوک وشبہات باقی رہ جاتے ہیں کہ کلائنٹ جو رقم نکلواتا ہے وہ اُس رقم کا کیا کرتا ہے؟ اسے شراکت کے کاروبار کی مد استعمال بھی کرتا ہے یا نہیں؟ یا وہ اُس رقم کو کسی اور مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے؟ اگر وہ اسلامی بینک سے رقم لے کر جائے اور راستے میں وہ رقم اس کی تعدی کے بغیر ضائع ہو جائے حالاں کہ اس نے اُس رقم سے ابھی خریداری شروع بھی نہ کی ہو تو کیا اس صورت میں شرعی اصولوں کے مطابق اسلامی بینک اُس نقصان کی ذمہ داری لینے کی حامی بھرتا ہے۔ نیز کیا اس صورت میں شراکت باقی رہتی ہے؟ کیوں کہ فقہا کے نزدیک اگر شراکت کا سرمایہ مخلوط نہ ہوا ہو اور شراکت کی خریداری سے قبل ہی دونوں یا کسی ایک کا سرمایہ ضائع ہو جائے تو شرکت باطل ہو جاتی ہے، جیسا کہ امام ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ (۸۶۱ھ) کی عبارت سے واضح ہے۔ یہ تمام وہ سوالات ہیں جن سے متعلق رننگ مشارکہ میں کسی قسم کی تفصیل تو در کنار اشارہ بھی نہیں ملتا۔

رننگ مشارکہ کے سرمائے کا استعمال

اسلامی بینک کا اس بات سے کوئی تعلق اور واسطہ تک ہی نہیں کہ سرمایہ دار کلائنٹ ان سے سرمایہ لے جانے کے بعد اُسے کس استعمال میں لاتا ہے؟ وہ اس رقم کو اپنے بیان کردہ کاروبار میں لگاتا ہے یا صرف اپنے ملازمین کی تنخواہوں کو پورا کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے، یا کسی اور مد میں استعمال کرتا ہے۔ حالاں کہ اسلامی بینک کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بارے میں اقدامات کرے اور اس سرمائے کی رقم کے موعود مقصد کے لیے استعمال کو یقینی بنائے۔ لیکن رننگ فنانس کی طرح یہاں بھی بینک کو اپنے کلائنٹ کے کاروبار سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مرابحہ کے عقد میں کلائنٹ جب ایجنٹ کی حیثیت میں گاڑی خریدتا ہے تو اس سے گاڑی کی خرید کی صحت کو جانچنے کے لیے رسیدیں، گاڑی کے کاغذات، چالان فارم وغیرہ کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کلائنٹ کی جانب سے بیع عینہ کا امکان ہوتا ہے۔ اس لیے اسلامی بینکوں پر یہ لازم کیا جاتا ہے کہ وہ اس طرح کے امکانات کے سدباب کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ تو کیا اسلامی بینک رننگ مشارکہ میں اس طرح کے امکانات کے سدباب کے لیے کلائنٹ کے کاروبار پر نظر رکھتا ہے؟ تو جواب ہے کہ اسلامی بینک اس بات کا قطعاً خیال نہیں رکھتا۔

رنگ مشارکہ میں اسلامی بینک شریک ہوتا ہے اور شرکت عقد میں شرکا ایک دوسرے کے باہم وکیل ہوتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں کاروبار میں تصرف کا اختیار ہوتا ہے اور انھیں یہ حق بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی شریک اپنے اس اختیار سے دست بردار ہونا چاہے تو ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ دست برداری کا اختیار اُس شریک کو ہوگا کہ جس کا سرمائے اور منافع میں من کل الوجوہ حق اپنا ذاتی ہوگا۔ اس تناظر میں کیا اسلامی بینک ایسا شریک ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے اس سرمائے اور منافع پر من کل الوجوہ حق اسلامی بینک کا نہیں ہوتا کیوں کہ اس کے پاس ڈپازٹرز کا پیسہ مضاربت کی مد میں ہوتا اور اسلامی بینک مضارب کی حیثیت میں اس سرمائے کو استعمال میں لاتا ہے۔ گویا سرمائے اور منافع میں ڈپازٹرز یعنی رب المال کا حق بھی ہوتا ہے۔ مضارب پر وکیل ہونے کی حیثیت سے یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسے فیصلے کرے جس سے اُس کے رب المال (مؤکل) کے حق کی حفاظت ہو۔ اس تناظر میں اسلامی بینک کا اپنے کلائنٹ کے کاروبار میں حق تصرف سے دست بردار ہونے میں اپنے ڈپازٹرز یعنی رب المال کے حق کی کون سی حفاظت ہے یہ سمجھ سے بالاتر ہے اور کون سا ذی عقل اس فیصلے کو رب المال کے حق میں بہتر فیصلہ قرار دے گا۔ نیز اس دست برداری میں ایک اخلاقی برائی بھی ہے اور وہ ڈپازٹرز کے حقوق سے دست بردار ہوتے ہوئے کلائنٹ کو فائدہ پہنچا کر مارکیٹ میں اپنے لیے نیک نامی کمانا ہے، کیوں کہ کلائنٹ تو یہی کہے گا کہ اُسے اسلامی بینک نے فائدہ پہنچایا ہے۔ لیکن یہ فائدہ کس کے حقوق کی پامالی پر دیا گیا ہے اہل علم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ (اسلامی بینک سے وابستہ ماہرین کا کہنا ہے کہ اسلامی بینک ڈپازٹر سے مضاربہ مطلقہ کا عقد کرتے ہیں جس سے اسلامی بینک کو یہ حق مل جاتا ہے کہ وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے میں خود مختار ہوتی ہے۔ اس بارے میں آگے بحث کی گئی ہے)۔

سرمائے کا مخلوط صورت میں ہونا

شرکت العقد میں اگر ایک شریک کا مال نقدی کی صورت میں ہو اور دوسرے کا سرمایہ عروض یعنی سامان وغیرہ کی صورت میں ہو تو شوافع کے نزدیک یہ شرکت منعقد نہیں ہوگی کیوں کہ شرکت کے سرمائے کو باہم مخلوط کرنے کے لیے شرکا کے سرمائے کا ایک ہی جنس سے ہونا لازمی ہے[۷۴] جب کہ یہاں ایک شریک کا سرمایہ نقدی تو

۷۴- ابن قدامہ، مصدر سابق، ۵: ۱۴

دوسرے کا سامان ہے۔ مالکی فقہا مطلق طور پر کہتے ہیں کہ شرکتِ عقد کے سرمائے کو مخلوط کرنا لازمی نہیں ہے اس لیے ان کے نزدیک یہ صورت جائز ہے۔[۷۵] اس بارے میں المعاییر الشرعیہ میں مالکی فقہا کی رائے پر فتوی دیتے ہوئے ایسی شرکت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ چناں چہ المعاییر الشرعیة میں کہا گیا ہے: "يجوز باتفاق الشركاء الإسهام بموجودات غير نقدية (عروض) بعد تقويمها بالنقد لمعرفة مقدار حصة الشريك."[۷۶] (غیر نقدی اثاثے کی قیمت لگوانے کے بعد تمام شرکا کے اتفاق سے شرکت کا سرمایہ بنانا جائز ہے تاکہ اُس شریک کے سرمایے کی مقدار معلوم ہو جائے۔)

یعنی اگر ایک شریک سامان کی صورت میں سرمایہ فراہم کرتا ہے تو شرکت میں اُس کا حصہ متعیّن کرنے لیے مارکیٹ میں اُس کے سامان کی قیمت معلوم کی جائے گی۔ جو اُس کے سامان کی قیمت ہو گی وہی اُس کا سرمایہ شرکت شمار ہو گا۔ اس طرح اُس کے سرمائے کا تناسب معلوم کر کے اُس کے لیے شرح منافع متعیّن کرنا ممکن ہو گا۔ اس طرح المعاییر الشرعیہ میں سرمائے کے باہم اختلاط سے صرفِ نظر کیا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ المعاییر الشرعیہ کی نظر میں شرکا کے سرمائے کا باہم مخلوط ہونا کوئی اہم شرط نہیں ہے۔ تاہم المعاییر الشرعیة کی عبارت سے ضمناً یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر سرمائے کی مقدار کی تعیین کو مؤخر کرنا جائز ہوتا تو یقیناً سامان کی تقویم میں بھی تاخیر روا ہوتی کیوں کہ بالآخر دونوں کی مراد ایک ہی ہے۔

رننگ مشارکہ میں کلائنٹ کی جانب سے مخلوط سرمایہ ہوتا ہے جو نقدی، قابلِ وصول دیون اور مختلف سامان کی صورت میں مخلوط ہوتا ہے۔ اس لیے شرکت کے جواز کے لیے یہ لازمی ہے کہ کلائنٹ کے مکمل بزنس کی مارکیٹ ویلیو معلوم کی جائے تاکہ کلائنٹ کے سرمائے کی حتمی مقدار متعیّن ہو سکے۔ لیکن رننگ مشارکہ میں ایسا کچھ بھی نہیں کیا جاتا کیوں کہ کلائنٹ کے سرمائے کا تعیّن بھی انتہاے عقد شرکت میں منافع کی تقسیم سے قبل کیا جاتا ہے۔

۷۵- محمد بن احمد الدسوقی المالکی (۱۲۳۰)، حاشية الدسوقي على الشرح الكبير (دار الفكر)، ۳: ۳۴۹۔

۷۶- المعاییر الشرعیة، مرجع سابق، دفعہ نمبر: ۳/۱/۲/۱۔

حنفی فقہا کے نزدیک اگر ایک شریک کا سرمایہ نقدی اور دوسرے کا سرمایہ سامان کی صورت میں ہو تو شرکت منعقد نہیں ہوگی کیوں کہ احناف کے نزدیک تمام شرکا کے سرمائے کا صرف نقدی صورت میں ہونا لازمی ہے۔[۷۷] البتہ امام کاسانی رحمۃ اللہ علیہ (۵۸۷ھ) اس بارے میں ایک مخرج[۷۸] تجویز کرتے ہیں:

وَلَوْ كَانَ مِنْ أَحَدِهِمَا دَرَاهِمُ، وَمِنَ الْآخَرِ عُرُوضٌ، فَالْحِيلَةُ فِي جَوَازِهِ أَنْ يَبِيعَ صَاحِبُ الْعُرُوضِ نِصْفَ عَرْضِهِ بِنِصْفِ دَرَاهِمِ صَاحِبِهِ، وَيَتَقَابَضَا، وَيَخْلِطَا جَمِيعًا حَتَّى تَصِيرَ الدَّرَاهِمُ بَيْنَهُمَا، وَالْعُرُوضُ بَيْنَهُمَا، ثُمَّ يَعْقِدَانِ عَلَيْهِمَا عَقْدَ الشَّرِكَةِ فَيَجُوزُ[۷۹]

(شرکتِ عقد میں) اگر ایک شریک کی جانب سے دراہم جب کہ دوسرے کی جانب سے عروض (سامان) ہو تو اس (شرکت) کے جواز میں یہ حیلہ اپنایا جا سکتا ہے کہ سامان کا مالک اپنا نصف سامان دوسرے شریک کے نصف دراہم کے بدلے فروخت کر دے اور دونوں شریک عوضین پر قبضہ بھی کر لیں اور اپنے سرمائے باہم مخلوط کر دیں تا کہ دراہم اور سامان میں دونوں میں مشترک ہو جائیں پھر اس مخلوط مال پر شرکت العقد کریں تو یہ جائز ہوگا۔

شرکتِ عقد میں عروض کو سرمایہ بنانے کے حوالے سے رنگ مشارکہ کے حامی امام الکاسانیؒ (۵۸۷ھ) کے بیان کردہ اسی حیلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر عمل کرتے ہوئے عروض میں شرکت کو جائز قرار دیا جائے تو احناف اور حنابلہ کی دلیل کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دو شرکا اپنا اپنا سامان لے کر شرکتِ عقد میں داخل ہوں تو یہ متصور کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنا نصف دوسرے کے نصف کے بدلے میں فروخت کر دیا۔ مثلاً اگر زید اور بکر علیحدہ علیحدہ دو کاروں میں شرکت کریں تو یہ مطلب سمجھا جائے کہ زید نے اپنی کار کا نصف بکر کی نصف کار کے بدلے میں فروخت کیا اور اس طرح دونوں افراد دونوں کاروں کے نصف کے مالک بن گئے اور دونوں کا مال مخلوط ہو گیا کہ اب دونوں کے حصے ایک دوسرے سے شناخت کے قبل نہ رہے لہٰذا امام احمدؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے مذہب پر بھی عمل ہو گیا۔[۸۰]

۷۷۔ السرخسی، مصدر سابق، ۱۱: ۱۶۶ (لَا يَصِحُّ أَنْ يَكُونَ رَأْسُ مَالِ أَحَدِهِمَا دَرَاهِمَ وَرَأْسُ مَالِ الْآخَرِ عُرُوضًا فِي مُفَاوَضَةٍ وَلَا عَنَانٍ؛ لِجَهَالَةِ رَأْسِ الْمَالِ فِي نَصِيبِ صَاحِبِ الْعُرُوضِ)

۷۸۔ حنفی فقہا کے نزدیک حیلے دو طرح کے ہوتے ہیں جائز اور ناجائز، جب کہ حنبلی فقہا حیلے کی اصطلاح کو منفی معنی میں لیتے ہیں۔ چناں چہ وہ جائز حیلے کے لیے مخرج کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ناجائز حیلے کے لیے حیلے کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ گویا حنفی فقہا جسے جائز حیلہ کہتے ہیں وہ حنابلہ کے نزدیک مخرج شمار ہوتا ہے۔

۷۹۔ الکاسانی، مصدر سابق، ۶: ۵۹۔

۸۰۔ عمران اشرف عثمانی، مرجع سابق، ۲۵۵۔

رنگ مشارکہ کے مؤیدین نے اسی مفہوم کو بنیاد بنا کر احناف کے نزدیک رنگ مشارکہ کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالاں کہ امام الکاسانیؒ (۵۸۷ھ) کے الفاظ بہت ہی واضح ہیں کہ شریکین ایک دوسرے کے ساتھ باقاعدہ بیع کریں اور عوضین پر قبضہ کریں، اسی لیے تو انھوں نے ''وَيَتَقَابَضَا'' کے الفاظ ذکر کیے اور اس کے بعد فرمایا ''وَيَخْلِطَا جَمِيعًا حَتَّى تَصِيرَ الدَّرَاهِمُ بَيْنَهُمَا، وَالْعُرُوضُ بَيْنَهُمَا'' جس کا مطلب بعض فقہا کے نزدیک یہ ہے کہ پہلے ان کے مابین شرکت الملک قائم ہوگی اسی لیے تو انھوں نے ''وَيَخْلِطَا جَمِيعًا'' کے الفاظ لکھے کیوں کہ احناف کے نزدیک شرکت الملک کے لیے شرکا کے حصص کا مخلوط ہونا لازمی شرط ہے۔[۸۱] یعنی سب سے پہلے بیع کے بعد شرکا کے مابین شرکت الملک قائم ہوگی پھر وہ ایک دوسرے کے ساتھ شرکت العقد کا معاہدہ کریں گے۔ تاہم امام البابرتی رحمۃ اللہ علیہ (۷۸۶ھ) نے امام الکاسانی رحمۃ اللہ علیہ (۵۸۷ھ) کے بیان کردہ حیلے سے شرکت الملک کے قائم ہونے کو غلط قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد صرف بیع ہے اور اس کے بعد شرکتِ عقد کا قیام ہی مراد ہے۔[۸۲]

الغرض امام الکاسانی رحمۃ اللہ علیہ (۵۸۷ھ) کی عبارت میں کہیں سے بھی یہ شائبہ تک نہیں ہوتا کہ ان کے بیان کردہ حیلے سے یہ مراد لے لیا جائے کہ اگر ایک شریک کے درہم اور دوسرے شریک کا سامان ہو تو یہ ''سمجھ لیا جائے'' کہ انھوں نے ایک دوسرے سے بیع کر لی ہے جیسا کہ رنگ مشارکہ کے حامی اس بارے میں ''متصور کیا جائے'' اور ''تو یہ مطلب سمجھا جائے'' کے الفاظ استعمال کر کے شرکا کے مابین ہونے والی ایک حقیقی بیع اور حقیقی شرکت الملک کو ایک متوہم بیع اور متوہم شرکت الملک بنا دیتے ہیں۔ پھر اسی متوہم موقف کو بنیاد بنا کر جدید کمپنیوں میں شراکت داری کی ناجائز صورتوں تک کو جواز کی سند فراہم کر دیتے ہیں اور بالآخر رنگ مشارکہ کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔

رنگ مشارکہ کی صورت کو ملاحظہ کیا جائے تو کہیں سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسلامی بینک کلائنٹ سے اس کا کچھ سامان خریدتا ہو اور اس پر قبضہ کیا جاتا ہو پھر ان دونوں کے مابین شرکت الملک قائم ہوتی ہو اور تب جا

۸۱۔ السرخسی، مصدر سابق، ۱۱: ۱۶۲؛ **مجلة الأحكام العدلية** (کراچی: نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب)، ۲۰۴؛ امام ابن ہمام، **فتح القدیر**، ۶: ۱۷۲ (لِأَنَّ بِالْخَلْطِ تَثْبُتُ شَرِكَةُ الْمِلْكِ)؛ زین الدین المعروف بابن النجیم (۹۷۰ھ)، **البحر الرائق شرح كنز الدقائق** (بیروت: دار الكتاب الإسلامي)، ۵: ۱۸۰۔

۸۲۔ البابرتی، مصدر سابق، ۶: ۱۷۴۔

کر وہ شرکت العقد کا معاہدہ کرتے ہوں۔ چلیں اگر امام البابرتی رحمۃ اللہ علیہ (۷۸۶ھ) کے قول پر عمل کرتے ہوئے شرکت الملک کے قیام سے صرفِ نظر بھی کر لیا جائے تو بھی یہاں حقیقی بیع کا وجود معدوم ہے کیوں کہ اُسے تو صرف ایک متوہم بیع مانا گیا ہے۔ متوہم بیع ناجائز ہوتی ہے کیوں کہ حقیقی بیع کے نفاذ سے سامان سے متعلق ملکیت اور رسک کی منتقلی کا معاملہ اٹھتا ہے جس سے مزید دیگر شرعی احکام نکلتے ہیں اور یہ سب امور متوہم بیع میں ناممکن ہیں۔ رننگ مشارکہ کا معاملہ ان ساری شرعی پابندیوں سے آزاد نظر آتا ہے۔ لہذا رننگ مشارکہ کی یہ صورت نہ تو **المعايير الشرعية** کے شرعی معیار کے بنیادی تقاضے کو پورا کرتی ہے اور نہ ہی امام کاسانیؒ کے بیان کردہ تخرج پر پورا اترتی ہے۔ پھر کیسے مان لیا جائے کہ یہاں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر عمل ہو گیا۔

رننگ مشارکہ میں منافع کی تعیین اور تقسیم میں فقہی اشکال

رننگ مشارکہ میں ابتدا ہی میں یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ اسلامی بینک مشترکہ بزنس کے کل منافع میں سے اپنے سرمائے پر مثال کے طور پر KIBOR∓1% جیسے 7 فیصد کی شرح کے برابر کی رقم بطور نفع وصول کرے گا۔ یعنی اسلامی بینک منافع میں سے ایک خاص رقم بطور نفع مقرر کرتا ہے جو شراکت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ کلاسیکل فقہا اور **المعايير الشرعية** کے نزدیک ایسی شرکت جائز نہیں ہوتی۔ چناں چہ **المعايير الشرعية** میں ہے: "لا يجوز أن يشترط لأحد الشركاء مبلغ محدد من الربح أو نسبة من رأس المال" [۸۳] (کسی بھی شریک کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ منافع میں سے کوئی ایک خاص رقم یا اپنے سرمائے کی کسی شرح کی شرط لگائے۔)

رننگ مشارکہ میں ایک طرف یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ ایک خاص سطح تک کے منافع کی تقسیم اسلامی بینک اور کلائنٹ کے مابین ان کے سرمائے کے تناسب سے ہو گی جب کہ دوسری طرف یہ طے کیا جاتا ہے کہ اسلامی بینک کل منافع میں سے صرف اتنی رقم وصول کرے گا جو اُس کے مطلوبہ منافع یعنی سرمائے کے ۷ فیصد کے برابر ہو گی۔ یہ دونوں امور یکسر ایک دوسرے سے مختلف ہیں کیوں کہ پہلی شرط غیر معلوم مقدارِ منافع کی متقاضی ہے جب کہ دوسری شرط معلوم مقدارِ منافع کی متقاضی ہے۔ اس بارے میں جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

The ratio of profit for each partner must be determined in proportion to the actual profit accrued to the business, and not

---

۸۳- **المعايير الشرعية**، مرجع سابق، دفعہ نمبر: ۳/ ۱/ ۵/ ۸۔

in proportion to the capital invested by him. It is not allowed to fix a lump sum amount for any one of the partners, or any rate of profit tied up with his investment.(84)

ہر شریک کے نفع کی شرح اُس کی طرف سے کی جانے والی سرمایہ کاری کی نسبت کی بجائے کاروبار میں حقیقتاً ہونے والے نفع کی نسبت سے طے ہونی چاہیے۔ کسی شریک کے لیے کوئی لگی بندھی مقدار مقرر کرنا یا نفع کی ایک ایسی شرح طے کرنا جو اُس کی طرف سے لگائے گئے سرمائے سے منسلک ہو، جائز نہیں ہے۔

رننگ مشارکہ کی ابتدا میں یہ بھی طے کر لیا جاتا ہے کہ اسلامی بینک کو اس کا مطلوبہ منافع ملنے کے بعد منافع کی جتنی بھی رقم ہو گی اس میں سے اسلامی بینک ۰۰۰۰۱. فیصد لے گا جب کہ بقیہ ۹۹.۹۹۹۹۹ فیصد کلائنٹ کو دے دی جائے گی۔ یہ ایک ایسی شرط ہے کہ جس کا نہ تو حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی اِس پر کسی بھی زمانے کا عرف و تعامل مل سکتا ہے۔ اس شرط پر چند فقہی اشکال وارد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا شرکتِ عقد کے کسی معاملے میں عقد کرتے وقت ایک شریک دوسرے شریک کو ہبہ کرنے یا ایک خاص حد سے زیادہ سارا منافع دینے یا کچھ منافع دینے کی شرط لگا سکتا ہے؟ اور کیا ایسے طریق کار کو سب بینکوں اور پوری اسلامی بینکنگ مارکیٹ میں رائج کیا جا سکتا ہے اور پھر اُس صورت میں اسے مشارکہ کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ دوسرا اشکال یہ کہ کیا کسی مضارب (بینک جو مضاربہ کی بنیاد پر ڈیپازٹ لیتا ہے) کے لیے منافع سے متعلق یہ فیصلہ کرنا جائز ہے کہ ایک خاص حد سے زائد منافع ہونے کی صورت میں مضارب وہ زائد منافع مکمل طور پر یا تقریباً مکمل طور پر کسی اور فریق کو دے سکے؟ تیسرا اشکال یہ کہ کیا رب المال کی اجازت سے مضارب ایسا اقدام کر سکتا ہے؟ اگر وہ ایسا اقدام کر سکتا ہے تو اس کی کوئی حد بھی ہو گی یا جو بھی اُس کی منشا میں آئے کر گزرے؟

شریک اور مضارب کا اختیار

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا شرکتِ عقد کے کسی معاملے میں عقد کرتے وقت ایک شریک دوسرے شریک کو ہبہ کرنے یا ایک خاص حد سے زیادہ سارا منافع دینے یا کچھ منافع دینے کی شرط لگا سکتا ہے؟ تو اس بارے میں فقہی کتب میں موجود مباحث کی روشنی میں جواب دیا جا سکتا ہے کہ شرکت کا عقد کرتے وقت کسی بھی شریک کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے لیے شرح منافع کے علاوہ کوئی اور رقم بھی مقرر کرے۔ تاہم تقسیم منافع کے وقت اگر کوئی شریک اپنی خوشی سے منافع میں سے کوئی خاص رقم دوسرے شریک کو دینا چاہتا ہو تو یہ جائز ہے،

84– Muhammad Taqi Usmani, *An Introduction to Islamic Finance*, 23

بشرطے کہ شرکت کا عقد کرتے وقت پہلے سے یہ شرط عائد نہ کی گئی ہو۔ چناں چہ اس بارے میں المعاییر الشرعیہ میں ہے: "ولا مانع من الاتفاق عند التوزيع على تعديل نسب الأرباح أو تنازل أحد الأطراف عن جزء منها لطرف آخر"[۸۵] (اس بارے میں کوئی ممانعت نہیں ہے کہ شرکا تقسیمِ منافع کے وقت تقسیمِ منافع کی شرح تبدیل کرنے یا کسی شریک کے لیے منافع کے ایک حصے سے دست بردار ہونے پر باہم اتفاق کرلیں۔)

یعنی شراکت کے اختتام پر منافع تقسیم کرتے وقت شرکا کے لیے ایک دوسرے کے حق میں اپنے حصہ منافع سے دست بردار ہو جانا جائز ہے بشرطے کہ عقد کی ابتدا میں ہی اس دست برداری کو بطورِ شرط ذکر نہ کیا گیا ہو۔ جب کہ رننگ مشارکہ میں اسلامی بینک عقد کی ابتدا میں ہی یہ طے کرلیتے ہیں کہ وہ مطلوبہ منافع لینے کے بعد بقیہ منافع کلائنٹ کو دے دیں گے۔ اس کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ المعايير الشرعية میں ہی اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ شرکا اس بات پر اتفاق کرسکتے ہیں کہ ایک خاص حد سے زیادہ منافع ہونے کی صورت میں زائد منافع پر فلاں شریک کا حق ہوگا یا وہ زائد منافع شرکا میں فلاں فلاں شرح سے تقسیم ہوگا۔

"يجوز الاتفاق على أنه إذا زادت الأرباح عن نسبة معينة فإن أحد اطراف الشركة يختص بالربح الزائد عن تلك النسبة فان كانت الأرباح بتلك النسبة أو دونها فتوزيع الأرباح على ما اتفقا عليه"[۸۶] (شرکا اس بات پر اتفاق کرسکتے ہیں کہ ایک معین شرح سے زائد نفع حاصل ہونے کی صورت میں زائد منافع کسی ایک شریک کو دے دیا جائے گا اور اگر منافع معین شرح کے برابر یا اُس سے کم ہو تو ان میں پہلے سے متفق علیہ شرح کے حساب سے منافع تقسیم ہوگا۔)

لہٰذا اسلامی بینک کے لیے معیّن شرح سے زائد منافع اپنے کلائنٹ کو دینا جائز ہے۔ اس دلیل کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ جواز صرف اُس شریک کے لیے ہے جس کا سرمایہ شرکت اپنا ذاتی ہو اور اُس زائد منافع پر من کل الوجوہ حق بھی صرف اُسی کا اپنا ہو۔ لیکن رننگ مشارکہ کے معاملے میں نہ تو کل سرمایہ شرکت اسلامی بینک کا اپنا ہوتا ہے اور نہ ہی زائد منافع پر من کل الوجوہ حق اُس کا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اسلامی بینک رننگ مشارکہ میں جو رقم

۸۵۔ المعايير الشرعية، دفعہ نمبر: ۳/ ۵/ ۱/ ۲۔

۸۶۔ نفس مرجع، دفعہ نمبر: ۳/ ۵/ ۱/ ۹۔

بطور سرمایہ مہیا کرتا ہے اُس میں زیادہ حصہ مضاربہ ڈپازٹس کا ہوتا ہے جس میں اسلامی بینک کی حیثیت صرف مضارب کی ہوتی ہے اور کچھ حصہ اسلامی بینک کا اپنا ہوتا جس میں اس کی حیثیت شریک کی ہوتی ہے تو اسلامی بینک صرف شریک ہی نہیں ہوتا بلکہ مضارب بھی ہوتا ہے اور اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی مضارب کے لیے منافع سے متعلق یہ فیصلہ کرنا جائز ہے کہ ایک خاص حد سے زائد منافع ہونے کی صورت میں مضارب وہ زائد منافع مکمل طور پر یا تقریباً مکمل طور پر کسی اور فریق کو دے سکے؟ فقہا کی آرا کی روشنی میں یہ بات توطے ہے کہ مضارب کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی منشا کے مطابق جس کو چاہے جتنا منافع ہبہ کر دے۔ یہ بھی منقول ہے کہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے رننگ مشارکہ میں اسلامی بینک کو ہبہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔[۸۷] کیوں کہ بحیثیتِ فقیہ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ فقہا اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ (۴۸۳ھ) فرماتے ہیں: "إِذَا قِيلَ لَهُ اعْمَلْ فِيهِ بِرَأْيِكَ وَلَا يَمْلِكُ الْقَرْضَ؛ لِأَنَّهُ تَبَرُّعٌ لَيْسَ مِنْ صُنْعِ التُّجَّارِ عَادَةً فَلَا يَمْلِكُهُ بِهَذَا اللَّفْظِ كَالْهِبَةِ وَالصَّدَقَةِ"[۸۸] (جب مضارب سے کہا جائے کہ اپنی مرضی سے کام کرو تو اسے (رب المال کی جانب سے) قرض دینے کی اجازت نہیں ہوگی کیوں کہ یہ تبرع ہے جو تاجروں میں معروف نہیں ہوتا اس لیے ان الفاظ سے وکیل کو ہبہ اور صدقہ کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔)

اس کے علاوہ المعايير الشرعية میں بھی مضارب کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ وہ صدقات وخیرات یا ہبہ کرے۔ جیسا کہ المعايير الشرعية میں ہے؛ "لا يجوز للمضارب أن يقرض أو يهب أو يتصدق من مال المضاربة ولا أن يتنازل عن الحقوق إلا بإذن خاص من رب المال"[۸۹] (مضارب کے لیے مضاربت کے مال میں سے قرض، ہبہ یا صدقہ دینا جائز نہیں ہے اور نہ ہی رب المال کی خاص اجازت کے بغیر اُس کے کسی حق سے دست بردار ہونا جائز ہے۔)

اسلامی بینک کے ماہرین کلائنٹ کو زائد منافع دینے سے متعلق عموماً یہ موقف اپناتے ہیں کہ اسلامی بینک مضاربہ ڈپازٹس میں لوگوں سے مضاربہ مطلقہ کی بنیاد پر رقوم قبول کرتے ہیں اور مضاربہ مطلقہ میں رب المال کی جانب سے مضارب کو مختلف فیصلے لینے کی عام اجازت ہوتی ہے جیسے راس المال کہاں انوسٹ کرنا ہے؟ کس کے ساتھ

87– Muhammad Ayub, op.cit., 12.

۸۸– السرخسی، مصدر سابق، ۲۲: ۴۰۔

۸۹– المعايير الشرعية المعيار: المضاربة، رقم المعيار(۱۳)، دفعہ نمبر: ۹/۶۔

انوسٹ کرنا ہے؟ کیا شرح منافع طے کرنی ہے؟ وغیرہ۔ رب المال کی اجازت سے مضارب کسی کو ہبہ، قرض یا صدقہ دینے یا اُس کے کسی حق سے دست بردار ہونے کا مجاز ہوتا ہے۔ اس لیے اسلامی بینک رننگ مشارکہ میں متعیّن شرح منافع سے زائد منافع اپنے کلائنٹ کو ہبہ کر سکتا ہے۔ اس جگہ دو سوال پیدا ہوتے ہیں کیا رب المال کی اجازت سے مضارب ہبہ، قرض یا صدقہ دینے یا اُس کے کسی حق سے دست بردار ہونے جیسے اقدامات کر سکتا ہے؟ اور اگر وہ ایسے اقدامات کر سکتا ہے تو اس کی کوئی حد بھی ہوگی یا جو بھی اُس کی منشا میں آئے کر گزرے؟(۹۰) ان دونوں سوالوں کے جواب امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ (۴۸۳ھ) کی اس عبارت میں موجود ہیں:

فَإِنْ كَانَ قَالَ لَهُ اعْمَلْ فِيهِ بِرَأْيِكَ، فَلَهُ أَنْ يَعْمَلَ جَمِيعَ ذَلِكَ إِلَّا الْقَرْضَ؛ لِأَنَّهُ فَوَّضَ الْأَمْرَ فِي هَذَا الْمَالِ إِلَى رَأْيِهِ عَلَى الْعُمُومِ وَقَدْ عَلِمْنَا أَنَّ مُرَادَهُ التَّعْمِيمُ فِيمَا هُوَ مِنْ صُنْعِ التُّجَّارِ عَادَةً فَيَمْلِكُ بِهِ الْمُضَارَبَةَ وَالشَّرِكَةَ وَالْخَلْطَ بِمَالِهِ؛ لِأَنَّ ذَلِكَ مِنْ صُنْعِ التُّجَّارِ كَمَا يَمْلِكُ الْوَكِيلُ تَوْكِيلَ غَيْرِهِ بِمَا وُكِّلَ بِهِ إِذَا قِيلَ لَهُ اعْمَلْ فِيهِ بِرَأْيِكَ وَلَا يَمْلِكُ الْقَرْضَ؛ لِأَنَّهُ تَبَرُّعٌ لَيْسَ مِنْ صُنْعِ التُّجَّارِ عَادَةً فَلَا يَمْلِكُهُ بِهَذَا اللَّفْظِ كَالْهِبَةِ وَالصَّدَقَةِ(۹۱)

اگر رب المال مضارب سے یہ کہے کہ اپنی مرضی سے کاروبار کرو تو مضارب کے لیے رب المال کے سرمائے میں سے قرض دینے کے علاوہ باقی سب کچھ کرنا جائز ہے۔ کیوں کہ رب المال نے مالِ مضاربت کے معاملے میں مضارب کو عمومی اجازت دی ہے اور یہ ہم جانتے ہیں کہ اس عمومی اجازت سے مراد معاملات میں تاجروں کی عادت ہے اور مضارب اس اجازت سے دوسری مضاربت اور شرکت اور اپنے مال ملانے جیسے معاملات کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے، کیوں کہ یہ سب امور تاجروں میں معروف ہوتے ہیں، جیسے وکیل کسی ایسے معاملے میں ایک تیسرے شخص کو وکیل بنا سکتا جس میں خود اُسے وکیل بنایا گیا ہو اور جب اس سے کہا جائے کہ اپنی مرضی سے کام کرو تو اسے (موکل کی جانب سے) قرض دینے کی اجازت نہیں ہوگی کیوں کہ یہ تبرع ہے جو تاجروں میں معروف نہیں ہوتا اس لیے ان الفاظ سے وکیل کو ہبہ اور صدقہ کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔

یعنی امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ (۴۸۳ھ) کے نزدیک رب المال کی جانب سے دی گئی اِس اجازت کو مطلق طور پر نہیں لیا جائے گا بلکہ یہ اجازت تاجروں کے عُرف کی حد تک محدود ہوگی اور دیکھا جائے گا کہ اگر واقعی کاروباری عُرف میں رب المال کی ایسی اجازت سے مراد قرض، ہبہ یا صدقہ دینا معروف ہوگا تو مضارب کے لیے ایسا کرنا جائز

۹۰۔ وہ زائد منافع مقدار میں اُس نفع سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو اسلامی بینک اور کلائنٹ کے مابین اُن کے تناسب سے تقسیم ہوتا ہے۔

۹۱۔ السرخسی، مصدر سابق، ۲۲: ۴۰۔

ہو گا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا تو کیا کسی اور سیارے پر بھی ایسا عرف ملنا ناممکن ہے کہ جہاں رب المال اپنے ہاتھ کاٹ کر کسی مضارب کو پکڑا دے اور اس بات کو قبول کرے کہ مضارب جن کو چاہے ہبہ کرتا رہے۔

عُرف کے علاوہ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ رب المال کی جانب سے مضارب کو یہ اجازت کس مقصد کے لیے دی گئی تھی؟ اور یہ ایک واضح اور بیّن امر ہے کہ یہ اجازت دیتے وقت رب المال کے پیشِ نظر صرف اور صرف مضاربہ بزنس کی نفع آوری ہی ہو سکتا ہے نہ کہ خود کو نفع کی بہت بڑی رقم سے محروم کرنا۔ اس کی وضاحت امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ (۴۸۳ھ) کی درج ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:

وَلَوْ وَكَّلَ الْمُضَارِبُ رَجُلًا أَنْ يَشْتَرِيَ لَهُ عَبْدًا بِالْمُضَارَبَةِ فَاشْتَرَى لَهُ أَخَا رَبِّ الْمَالِ فَال شرا جَائِزٌ عَلَى الْمُضَارِبِ دُونَ رَبِّ الْمَالِ لِأَنَّ شرا وَكِيلِ الْمُضَارِبِ بِمَنْزِلَةِ شرا الْمُضَارِبِ بِنَفْسِهِ وَهُوَ لَوْ اشْتَرَى أَخَا رَبِّ الْمَالِ كَانَ مُشْتَرِيًا لِنَفْسِهِ لِأَنَّ رَبَّ الْمَالِ إِنَّمَا أَمَرَهُ أَنْ يَشْتَرِيَ بِمَالِ الْمُضَارَبَةِ مَا يُمْكِنُهُ أَنْ يَبِيعَهُ لِيُحَصِّلَ الرِّبْحَ بِتَصَرُّفِهِ وَهُوَ لَا يَحْصُلُ بِ شرا أَخِي رَبِّ الْمَالِ لِأَنَّهُ لَوْ جَازَ شِرَاؤُهُ عَلَى رَبِّ الْمَالِ عَتَقَ عَلَيْهِ فَلِهَذَا جَعَلْنَاهُ مُشْتَرِيًا لِنَفْسِهِ.

اگر مضارب کسی شخص کو مضاربت کے لیے ایک غلام خریدنے کا وکیل بناتا ہے اور وہ وکیل رب المال کے بھائی کو خرید لاتا ہے (یعنی رب المال کا بھائی ایک غلام تھا)۔ تو یہ خریداری رب المال کی بجائے مضارب کی ذاتی خریداری قرار پائے گی کیوں کہ مضارب کے وکیل کی خریداری ایسے ہو گی گویا کہ مضارب نے خود خریداری کی ہے۔ (اس کو یوں سمجھیں کہ) اگر مضارب خود رب المال کے بھائی کو مالِ مضاربت سے خریدتا تو اُس صورت میں بھی یہ خریداری مضارب کی ذاتی خریداری شمار ہوتی۔ کیوں کہ رب المال مضارب کو حکم دیتا ہے کہ وہ مالِ مضاربت سے وہ چیز خریدے کہ جس کو فروخت کرنے سے منافع حاصل ہو اور (یہ منافع) رب المال کے بھائی کو خریدنے کی صورت میں حاصل نہیں ہو گا کیوں کہ اگر اس خریداری کو رب المال کی خریداری قرار دیتے ہیں تو (جب رب المال کا غلام بھائی رب المال کی ملکیت میں آئے گا) رب المال پر اُسے آزاد کرنا واجب ہو گا (اور اس صورت میں رب المال کا کوئی منافع نہیں ملے گا)۔ لہٰذا ہم نے رب المال کے غلام بھائی کی خریداری کو مضارب کی ذاتی خریداری قرار دیا۔

یعنی مضارب نے رب المال کے بھائی کو خریدنے کی صورت میں رب المال کا کوئی مالی فائدہ نہیں کیا اور نہ اس کے لیے کسی منافع کا سبب بنا۔ جب کہ رب المال مضارب کو مضاربہ بزنس کی جو اجازت دیتا ہے اس کے پیچھے صرف اور صرف یہی مقصد کار فرما ہوتا ہے کہ وہ بزنس سے متعلق ایسے فیصلے کرے جو رب المال کے حق میں ہوں نہ کہ اُس کے خلاف ہوں۔ امام برہان الدین المرغینانی (۵۹۳ھ) کے نزدیک مضارب اگرچہ خرید و فروخت کے معاملات میں آزاد ہوتا لیکن اس کی یہ آزادی تاجروں کے عُرف سے مقیّد ہوتی ہے، اگر وہ تاجروں کے عُرف کے

خلاف کوئی خرید وفروخت کرتا ہے تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا۔ چناں چہ امام برہان الدین المرغینانی (۵۹۳ھ) فرماتے ہیں: "لِأَنَّ لَهُ الْأَمْرَ الْعَامَّ الْمَعْرُوفَ بَيْنَ النَّاسِ، وَلِهَذَا كَانَ لَهُ أَنْ يَشْتَرِيَ دَابَّةً لِلرُّكُوبِ، وَلَيْسَ لَهُ أَنْ يَشْتَرِيَ سَفِينَةً لِلرُّكُوبِ وَلَهُ أَنْ يَسْتَكْرِيَهَا اعْتِبَارًا لِعَادَةِ التُّجَّارِ"[92] (کیوں کہ مضارب کے لیے لوگوں کے مابین معروف معاملے کو دیکھنا لازم ہے اور اس لیے اُس کے لیے سواری کے طور پر چوپایہ خریدنا جائز ہے لیکن کشتی خریدنا جائز نہیں۔ تاہم اس کے لیے کشتی کو کرایے پر لینا جائز ہے کیوں کہ یہ تجاروں کے ہاں معروف ہے۔)

امام بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ (۸۵۵ھ)[93] کشتی خریدنے کی اجازت نہ ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں: "لِعَدَمِ جَرَيَانِ الْعَادَةِ فِيهِ"[94] (کیوں کہ اس بارے میں تاجروں کا عُرف و تعامل ہی نہیں ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مضارب کی آزادی کو بھی عُرف کی روشنی میں لیا جائے گا۔ کشتی خریدنے کی اجازت اس لیے نہیں کہ اس پر مال زیادہ خرچ ہوتا اور رب المال کے لیے اس میں نفع کی کمی یا نقصان کا باعث ہوتا، گویا رب المال کے حق کی حفاظت کے پیش نظر ایسا حکم دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مضارب کو اس بات کی بھی اجازت نہیں کہ وہ مضاربہ بزنس کے کسی اثاثے کو اگر بیچنا چاہے تو اُسے مارکیٹ کی قیمت سے کم پر بیچے اور اگر مضاربہ بزنس کے لیے کوئی اثاثہ خریدنا چاہے تو مارکیٹ کی قیمت سے زیادہ پر خریدے، کیوں کہ اس میں رب المال کی حق تلفی کا خطرہ ہوتا ہے، جیسا کہ المعايير الشرعية میں ہے: "ليس للمضارب أن يبيع بأقل من ثمن المثل وليس له أن يشتري

۹۲۔ المرغینانی، مصدر سابق، ۸: ۴۷۲۔

۹۳۔ بدرالدین محمود بن احمد ۷۶۲ھ/ ۱۳۶۰ء کو ترکی کے شہر عین تاب میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے آپ کو عینی کہا جاتا ہے۔ آپ زیادہ مدت حلب میں رہے مصر، دمشق اور بیت المقدس میں بھی رہے۔ آپ کو قابل فقیہ، مؤرخ اور بڑے محدثین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ۷۸۸ھ کو قاہرہ میں تشریف لائے اور قضاء مذہب امام ابو حنیفہ آپ کے سپرد ہوئی۔ آپ کی علمی خدمات میں **عمدة القاري في شرح البخاري، مباني الأخيار في رجال معاني الآثار، تاريخ البدر في أوصاف أهل العصر، مباني الأخبار في شرح معاني الآثار، البناية في شرح الهداية** قابل ذکر ہیں۔ (الزرکلی، **الأعلام**، ۷: ۱۶۳۔)

۹۴۔ محمود بن احمد المعروف بدرالدین العینی (۸۵۵ھ)، **البناية شرح الهداية** (بیروت: دار الكتب العلمية، ۱۴۲۰ھ)، ۱۰: ۸۲۔

بأكثر من ثمن المثل إلا لمصلحة ظاهرة يراها في الحالين"[۹۵] (مضارب کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی مصلحت کے بغیر (مضاربہ بزنس کا اثاثہ) ثمن مثل سے کم پر فروخت کرے اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ وہ کوئی چیز ثمن مثل سے زیادہ پر خریدے۔ دونوں صورتوں میں وہ مصلحت ظاہر ہونی چاہیے۔)

یعنی اگر کوئی واضح مصلحت ہو تو مضارب ایسا کر سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس مصلحت کا تعلق کس کی ذات سے ہونا چاہیے؟ واضح ہے کہ اُس مصلحت کا تعلق رب المال کی ذات سے ہو گا یعنی اگر ایسا کرنے میں کاروبار کو منافع ہونے کی امید ہو اور رب المال کا فائدہ ہو تو مضارب ایسا کرنے کا مجاز ہو گا۔ لیکن مضارب کا رب المال کے حق سے کلی طور پر دست بردار ہوتے ہوئے زائد منافع کی ساری رقم کسی تیسرے فریق کو ہبہ کر دینا کون سی مصلحت ہے؟ اگر واقعی یہ ایک مصلحت ہے تو اس کا تعلق کس کی ذات سے ہے مضارب یعنی اسلامی بینک کی ذات سے یا رب المال یعنی ڈپازٹرز کی ذات سے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مصلحت صرف اور صرف اسلامی بینک اور اس کے سرمایہ دار کلائنٹ کے حق میں ہوتی ہے اور ڈپازٹرز کو ان کے شرعی حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

اسی معاملے کو یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ اگر مضارب رب المال کو یہ بتا دے کہ وہ اس جازت کو استعمال کرتے ہوئے مستقبل میں ایک خاص حد سے زائد نفع کسی اور شخص کو ہبہ کرنے والا ہے خواہ وہ نفع کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو تو کیا مضارب رب المال سے ایسی اجازت لے پائے گا؟

مقاصد اور نتائج کی روشنی میں رننگ مشارکہ

اسلامی بینکار ہبہ سے متعلق اعتراض سے بچنے کے لیے یہ حیلہ اپناتے ہیں کہ وہ متعیّن منافع (Profit Ceiling) سے زائد منافع کی تقسیم کے لیے ایک اور شرح منافع متعیّن کر لیتے ہیں، جس میں طے یہ کیا جاتا ہے کہ زائد منافع میں سے اسلامی بینک کا حصہ ۰۰۰۰۱. فیصد ہو گا اور ۹۹.۹۹۹۹۹ فیصد کلائنٹ کا حصہ ہو گا اور اس طرح اعتراض بھی وارد نہیں ہو گا کیوں کہ ایک خاص حد سے زائد منافع میں نئی شرح منافع متعیّن کرنا شرع کی نظر میں بھی جائز ہے۔

اس طرح کی تعیین منافع اس حیلے کے عدمِ جواز میں از خود ایک واضح قرینہ ہے کیوں کہ اسلامی بینک بنیادی طور پر کلائنٹ کو ہبہ کرنا چاہتے تھے جس کے لیے انھوں نے زائد منافع کی صورت میں نئی شرح منافع متعیّن کرنے کا طریقہ اپنایا۔ اسلامی بینک اگرچہ ''نئی شرح منافع'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اس کے باوجود یہ ایک ہبہ ہے

۹۵۔ المعايير الشرعية، المعيار : المضاربة ،رقم المعيار (۱۳)، ،دفعہ نمبر:۹/ ۵۔

کیوں کہ ۱۰۰۰۰. فیصد ایک ایسی شرح ہے جو نہ ہونے کے مترادف ہے جیسا کہ پیچھے کی مثال میں دیکھا جا سکتا ہے کہ ۲.۲ کروڑ روپے کے اضافی منافع میں سے اسلامی بینک کا حصہ ۱۰۰۰۰. فیصد ہے جو کہ صرف مبلغ ۲۰۲ روپے بنتا ہے جب کہ بقیہ ۲۰,۱۹۹,۷۹۸ روپے کلائنٹ کو دے دیا جاتا ہے۔ اتنے میں کون ذی شعور اس تقسیم کو منافع کی حقیقی تقسیم قرار دے گا۔ حقیقت میں یہ کلائنٹ کے حق میں بینک کی دست برداری ہے جس کا عملاً مطلب یہ ہوا کہ بینک یہ کہے کہ مجھے اتنی رقم دو اور باقی خود رکھو اور یہ بہر کیف سود کی تعریف میں آتا ہے۔ نیز شریعت کا قاعدہ ہے: الْعِبْرَةَ فِي الْعُقُود للمقاصد والمعاني لَا للألفاظ والمباني[۹۶] (عقود میں الفاظ اور ان کی بناوٹ کی بجائے اُن الفاظ کے مقاصد اور معنی کا اعتبار کیا جاتا ہے)۔ لہٰذا اِس معاملے میں اسلامی بینک خواہ نئی شرح منافع کی تعیین کے مطابق تقسیم کرنے جیسے الفاظ استعمال کر تا رہے حقیقت میں اسے ایک ہبہ ہی کہا جائے گا۔ یہ عمل مضارب کی جانب سے رب المال کے حق کی قربانی دے کر ایک سرمایہ دار کلائنٹ کو نوازنے کا حیلہ ہے جو ناجائز ہے اور اسلامی منصفانہ تقسیم دولت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔

یوسف القرضاوی، منذر کہف اور نجات اللہ صدیقی جیسے محققین اپنی تصانیف میں سودی نظام کی اسی خرابی کی نشان دہی کرتے رہے ہیں کہ سودی مالیاتی اور بینکاری شعبے سرمایہ دار کے ساتھ مل کر معاشرے کے لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ چناں چہ جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اپنی کتاب ہمارا معاشی نظام میں سود کی خرابیوں کو شمار کرواتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: ”سود میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کاروبار کرنے والے کو نقصان ہو جائے تو سارا نقصان اس پر پڑتا ہے اور قرض دینے والے کا سود ہر حال میں کھرا رہتا ہے اور اگر نفع ہو جائے تو سارا نفع وہ لے اُڑتا ہے اور قرض دینے والے کو اس کا چالیسواں حصہ مشکل سے ہاتھ آتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح دولت پھیلنے کی بجائے سکڑتی ہے اور ہموار طریقے سے گردش نہیں کرتی۔“ (۹۷)

اپنی اسی کتاب کے آخر میں مشارکہ کے متعلق اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ایک سرکلر کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے ایسے شراکتی نظام کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وزیر خزانہ اور اسٹیٹ بینک کے سرکلر میں مشارکہ، پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ (PTCs) وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ان معاملات (شرکت) میں زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم منافع کی شرح وقتاً فوقتاً اسٹیٹ بینک کی طرف سے مقرر کی جائے گی، البتہ نقصان کی صورت میں نقصان ہر فریق اپنے لگائے ہوئے سرمائے کے تناسب سے برداشت کرے گا۔ اس

۹۶۔ احمد بن محمد الزرقا (۱۳۵۷ھ)، شرح القواعد الفقهية (دمشق: دار القلم، ۱۹۸۹ء)، ۷۹۔

۹۷۔ محمد تقی عثمانی، ہمارا معاشی نظام (کراچی: مکتبہ دار العلوم، ۱۴۲۳ھ)، ۱۵۔

میں اگر اسٹیٹ بینک کی طرف سے منافع کی شرح مقرر کرنے سے مراد یہ ہے کہ اسٹیٹ بینک مجموعی منافع کے تناسب سے تجارتی کمپنیوں اور بینکوں کا فی صد حصہ مقرر کرے گا تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ غیر سودی نظام بینکاری میں زر کے بہاؤ پر کنٹرول کرنے کے لیے اسٹیٹ بینک کے پاس یہ مؤثر ترین ذریعہ ہوگا، لیکن اگر خدانخواستہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسٹیٹ بینک سرمائے کے تناسب سے بینکوں کا کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ منافع مقرر کرے گا تو یہ انتہائی قابل اعتراض بات ہے اور اس کا نتیجہ پھر اسی سودی طریق کار کے تحفظ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اسٹیٹ بینک کے سرکلر میں شرح منافع کے لیے جو لفظ rates of profit استعمال ہوا ہے اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید پیش نظر یہ دوسری صورت ہے اور مقصد یہ ہے کہ بینک سے مشارکہ وغیرہ کا معاملہ کرنے والے کاروباری افراد یا داروں کو اطمینان دلایا جائے کہ اگر کاروبار کا حقیقی منافع اسٹیٹ بینک کی مقرر کردہ حد سے زائد ہوا تو وہ بینک اپنے پاس رکھنے کی بجائے انھی کو واپس کردے گا۔ لہٰذا ان کو یہ خوف نہیں کھانا چاہیے کہ اگر منافع زیادہ ہوا تو اس کا بہت بڑا حصہ بینکوں کے پاس چلا جائے گا۔ اگر اسٹیٹ بینک کے شرح منافع متعیّن کرنے کا مقصد واقعۃً یہی ہے تو ایک طرف شرعی اعتبار سے اس کا ہرگز جواز نہیں اور دوسری طرف اس سے غیر سودی نظام کا کوئی فائدہ معیشت کو حاصل نہیں ہوگا............... سرمایہ دار افراد تو شاید اس تحفظ کے فراہم ہونے سے خوش ہو جائیں، لیکن اسلامی احکام پر عمل کے نتیجے میں تقسیم دولت کے نظام میں جو توازن پیدا ہو سکتا تھا اس کی راہ بالکل مسدود ہو کر رہ جائے گی۔ خدا کرے "منافع کی شرح متعیّن" کرنے سے حکومت کی یہ مراد نہ ہو۔[۹۸]

اب تو معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہو چکا ہے کیوں کہ اب نہ صرف ایسی شرح منافع کا تعیّن اسٹیٹ بینک کی بجائے ہر اسلامی بینک خود کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا عُرف بن گیا ہے جس میں اسلامی بینک سودہ OD کی مطابقت میں بڑے بڑے کاروباری اداروں کو عملاً مقررہ شرح پر اربوں روپے فراہم کر رہے ہیں اور اس پر غضب یہ کہ اس کا نام مشارکہ رکھا گیا ہے۔ اسلامی بینکوں کے رننگ مشارکہ میں شرح منافع کے تعیّن کا یہ انداز کیا سودی نظام کی مانند اصل رب المال کی بجائے سرمایہ دار کی جیب نہیں بھر رہا؟ کیا اسلامی بینکوں کا رننگ مشارکہ نتائج کے اعتبار سے سودی بینکوں کے رننگ فنانس سے مشابہت نہیں رکھتا؟

شریعت میں جہاں کسی بھی معاملے کی ظاہری شکل وصورت اور اس کے بنیادی مقصد کو دیکھا جاتا ہے، وہیں اس کے نتائج کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ معاملات کے نتائج شرع کی نظر میں اہمیت رکھتے ہیں، ڈاکٹر احمد الریسونی کہتے ہیں:

۹۸۔ نفس مرجع، ۱۶۷۔ ۱۶۸۔

أن الأفعال لا يُحكم عليها بمجرد صورها وظواهرها، ولا بمجرد أسمائها، ولا بداياتها دون مآلاتها ونهاياتها بل الحكم الصحيح على أي فعل إنما يكون بالنظر إلى ظاهره وباطنِه، والباطنُ أولى، وبالنظر إلى صورته ونية صاحبه، والنيةُ فيه أولى، وبالنظر إلى بدايته وعاقبتِه، وعاقبته أولى، وبالنظر إلى اسمه وحقيقته، وحقيقته أولى.(۹۹)

افعال پر صحت و فساد کا حکم لگانے سے متعلق اُن کی صورت اور ظاہری حالت اور نہ ہی صرف اُن افعال کے ناموں پر انحصار کیا جائے گا، اسی طرح اُن کے نتائج کو پس پشت ڈالتے ہوئے صرف اُن کی ابتدا کو بھی مد نظر رکھتے ہوئے کوئی حکم نہیں لگایا جائے گا۔ بلکہ کسی بھی فعل سے متعلق صحیح حکم کے لیے اُس فعل کے ظاہر و باطن میں باطن کو مقدم رکھا جائے گا، فعل کی ظاہری صورت اور فاعل کی نیت میں سے فاعل کی نیت کو ترجیح دی جائے گی، فعل کی ابتدا اور اُس کے نتیجے میں سے نتیجے کو پیش نظر رکھا جائے گا اور فعل کی نام اور اُس کی حقیقت میں سے حقیقت کو راجح مانا جائے گا۔

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ (۴۸۳ھ) فرماتے ہیں: "الْأُمُورُ بِعَوَاقِبِهَا"(۱۰۰) (معاملات میں نتائج کا اعتبار کیا جاتا ہے)۔ امام عبد العزیز بخاری رحمۃ اللہ علیہ (۷۳۰ھ)(۱۰۱) کشف الأسرار شرح أصول البزدوي میں مفصل انداز میں اس اصول کو یوں بیان کرتے ہیں: "إِنَّمَا الْأُمُورُ بِعَوَاقِبِهَا أَيِ الْمُعْتَبَرُ عَوَاقِبُ الْأُمُورِ لَا ابْتِدَاؤُهَا"(۱۰۲) (معاملات میں انجام کار کو دیکھا جاتا ہے یعنی معاملات میں ابتدا کے بجائے اُن کے نتائج کا اعتبار کیا جاتا ہے)۔ بفرضِ محال اگر رنگ مشارکہ کی فقہی تشکیل سے صرفِ نظر کر بھی لیا جائے تو بھی نتائج کے اعتبار سے رنگ مشارکہ اسلامی بینکوں کو سودی بینکوں کی صف میں کھڑا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ رنگ مشارکہ بھی دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو فروغ دینے کا ایک سبب ہے اور رنگ فنانس کی مانند سرمایہ دار کی جیب بھرنے کا ہی ایک طریقہ ہے۔ لہٰذا نتیجے کے اعتبار سے رنگ فنانس اور رنگ مشارکہ میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہ جاتا۔

۹۹۔ احمد الریسونی، مقاصد المقاصد (بیروت: الشبكة العربية للأبحاث و النشر، ۲۰۱۳ء)، ۱۳۸۔

۱۰۰۔ السرخسی، مصدر سابق، ۱۳: ۱۳۱۔

۱۰۱۔ آپ کا مکمل نام عبد العزیز بن احمد ہے۔ تاہم آپ علاء الدین بخاری کے نام سے مشہور ہیں۔ اپنے وقت کے قابل اور اجل اصولی اور فقیہ تھے۔ آپ کا تعلق بخارا سے ہے۔ آپ کی تصنیفات و تالیفات میں کشف الأسرار شرح أصول البزدوي، شرح المنتخب الحسامي مشہور ہیں۔ (الزرکلی، ۴: ۱۳۔)

۱۰۲۔ علاء الدین عبد العزیز بن احمد (۷۳۰ھ)، کشف الأسرار شرح أصول البزدوي (بیروت: دار الكتاب الإسلامي)، ۴: ۲۶۲۔

جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا اس کی روشنی میں یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ "شرح منافع کی تعیین" سے اس حکومت کی جو مراد تھی سو تھی لیکن آج کل اسلامی بینکوں میں اُسی دوسری صورت پر ہی عمل کیا جارہا ہے جس کے لیے ۰۰۰۰۱. فیصد اور ۹۹.۹۹۹۹۹ فیصد کی غیر منصفانہ اور غیر معروف شروحات منافع خود ہی ایک بیّن قرینہ ہیں۔ لہٰذا یہاں بیک وقت "الْأُمُورُ بِمَقَاصِدِهَا" اور "الْأُمُورُ بِعَوَاقِبِهَا" کا صدور ہوتا ہے۔ ان ضوابط کی روشنی میں ایسی شرح منافع متعیّن کرنا در حقیقت ایک شریک کی جانب سے کسی تیسرے فریق کو ایسا ہبہ ہے جس میں دوسرے شریک کا وہ حق شامل ہوتا ہے جس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار اُسے نہیں تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی خرابیوں پر گفتگو کرتے ہوئے جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

سرمایہ دارانہ نظام میں بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے اپنی جیب سے صرف ۱۰ لاکھ روپے کسی کاروبار میں لگائے اور ۹۰ لاکھ روپے بینک سے قرض لے لیے اور اس طرح ایک کروڑ روپے سے تجارت کی، جب اتنی بھاری رقم سے تجارت کی جائے گی تو اس پر نفع کی شرح بھی بہت زیادہ ہوگی، فرض کریں کہ کاروبار میں ۵۰ فیصد منافع ہوا اور ایک کروڑ کے ڈیڑھ کروڑ بن گئے تو یہ سرمایہ دار پچاس لاکھ کے نفع سے صرف پندرہ لاکھ روپے سود کے طور پر بینک کو دے گا جس میں سے بینک اپنا نفع رکھ کر بمشکل دس یا بارہ لاکھ روپے ان سینکڑوں عوام میں تقسیم کرے گا جن کی امانتیں اس کے پاس جمع ہیں جس کا خالص نتیجہ یہ ہے کہ اس کاروبار میں جن سینکڑوں افراد نے ۹۰ لاکھ روپے کا سرمایہ لگایا تھا اور انھی کے سرمایہ نے در حقیقت اتنے بھاری نفع کو ممکن بنایا، ان میں تو کل دس بارہ لاکھ روپے تقسیم ہوئے اور جس سرمایہ دار نے کل ۱۰ لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی تھی، اُسے کاروبار کے نفع کی صورت میں ۳۵ لاکھ روپے ملے۔[۱۰۳]

رننگ مشارکہ کے حوالے سے بھی اسی طرح کی حقیقت کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

One RM contract entered into by the premier bank with a Company during 2008-09 revealed that the Bank contributed 75 % of the total RM investment. But the company, with only 25 % investment, took 97.5 % of the mushārakah profit giving only 2.5 % to the Bank, despite the fact that the ceiling rate agreed at that time was 14.40 % (1.00% over the KIBOR of 13.40%)[104]

۱۰۳- محمد تقی عثمانی، اسلام اور جدید معیشت و تجارت، (کراچی: مکتبہ معارف القرآن، ۲۰۰۳ء)، ۵۲-۵۳۔

104- Muhammad Ayub, op.cit, 12.

رنگ مشارکہ کے ایک معاہدہ جو ایک پریمیئر اسلامی بینک نے ۲۰۰۸-۰۹ میں ایک کمپنی (کلائنٹ) کے ساتھ کیا۔ اُس معاہدے سے یہ بات سامنے آئی کہ رنگ مشارکہ میں اسلامی بینک نے ۷۵ فیصد سرمایہ دیا تھا جب کہ کلائنٹ نے صرف ۲۵ فیصد سرمائے کی بنیاد پر مشارکہ کے کل منافع کا 97.5 فیصد حصہ وصول کیا اور اُس اسلامی بینک کے حصے میں صرف ۲.۵ فیصد منافع آیا، اس حقیقت کے باوجود کہ اُس وقت شرح منافع کی حد ۱۴.۴۰ فیصد مقرر کی گئی تھی جو اُس وقت کے KIBOR کی شرح سے بھی ایک فیصد زائد تھی۔

شرح منافع کی تعیین اور اس کی تقسیم سے متعلق جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی جانب سے ایک فرضی مثال اور اس کے بعد پیش کیے گئے اسلامی بینک کے حقیقی معاہدے میں صورتاً اور نتیجتاً کوئی فرق نظر نہیں آتا، سوائے اس کے کہ ایک معاملے کا نام سودی قرض جب کہ دوسرے کا نام رنگ مشارکہ رکھ دیا گیا۔ دونوں پروڈکٹ واضح طور پر اسلام کے تقسیم دولت کے منصفانہ اصول کی روح کے خلاف ہیں۔ فقہاے امت نے "الْأُمُورُ بِمَقَاصِدِهَا" اور "الْأُمُورُ بِعَوَاقِبِهَا" کے فقہی ضوابط کو اسی لیے وضع کیا تاکہ جائز اور ناجائز معاملے میں فرق واضح کیا جا سکے۔ رنگ مشارکہ سودی رنگ فنانس کی پیوندکاری کے سوا کچھ نہیں کیوں کہ وہی حقیقت یہاں بھی آشکار ہو رہی ہے کہ سرمایہ دار کم سرمایہ لگا کر بھاری منافع لے اڑتا ہے اور تھوڑا منافع جو مضاربہ کے حصے میں آتا ہے اُس میں سے اسلامی بینک بطور مضارب اپنا منافع وصول کرتا ہے اور بقیہ منافع مضاربہ پول کے ڈپازٹرز میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جسے کسی طور سے بھی دولت کی منصفانہ تقسیم نہیں کہا جا سکتا۔ اسلامی بینکوں کے رنگ مشارکہ کے اگر ابتدائی عقود ملاحظہ کیے جائیں تو پتا چلتا ہے کہ معین حد سے زائد منافع میں اسلامی بینک کا حصہ 01. فیصد بھی رہا، پھر کچھ عرصہ بعد ۰۰۱. فیصد بھی ہوا پھر ۰۰۰۱. فیصد ہوا تاہم اب کچھ بینکوں میں ۰۰۰۰۱. فیصد بھی مروّج ہے۔ معیّن حد سے زائد منافع میں شرح منافع کی تعیین میں یہ تدریجاً کمی واضح طور پر دلالت کر رہی ہے کہ دولت کے بہاؤ کا رخ سرمایہ داروں کی جیب کی جانب موڑنے میں اسلامی بینک سودی بینکوں سے مختلف نہیں ہیں۔ گویا چند ہاتھوں میں دولت کو مرتکز کرنے میں اسلامی بینک بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ جب کہ اسلامی بینکوں کو متعارف کرنے کا بنیادی مقصد ایسے غیر منصفانہ تقسیم دولت کی حوصلہ شکنی کرنا تھا جس میں اسلامی بینک رنگ مشارکہ جیسی پروڈکٹس کے تناظر میں گزرتے وقت کے ساتھ ناکام ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔

اسلامی بینک سے وابستہ افراد یہ بھی دلیل دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ شرکا کے مابین نفع کی شرح کیا ہو گی اسے شرع نے شرکا کی باہم رضامندی پر چھوڑا ہے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ موجودہ معاملے میں اسلامی بینک شریک تو ہے لیکن کس حیثیت میں؟ وہ کس کا پیسہ شرکت میں لگا رہا ہے؟ بنیادی طور پر اسلامی بینک اپنے مضاربہ ڈپازٹر کے مضارب یعنی وکیل کی حیثیت میں دوسرے فریق کے ساتھ شرکت کا عقد کرتا ہے تو کیا وکیل کو یہ اجازت ہو گی کہ وہ ایک ایسی شرح منافع مقرر کر کے آجائے جس میں رب المال کے حقوق پر ضرب پڑتی ہو؟ اس سے متعلق اوپر بحث گزر چکی ہے۔

رنگ مشارکہ میں پائے جانے والے دیگر مسائل

نقصان کی تقسیم: صرف کاغذی کارروائی

رنگ مشارکہ کی کاغذی کارروائی میں اسلامی بینک اور کلائنٹ شریک ہونے کی حیثیت میں اپنے اپنے تناسب کے مطابق نقصان برداشت کرنے کی حامی تو بھرتے ہیں، لیکن عملاً اس کی تعبیر ممکن نظر نہیں آتی۔ اس کی بنیادی وجہ کچھ یوں ہے:

However, practically it may never happen as the provisional profit as per the agreed profit ceiling is charged to the customer. Claim for any loss is subject to availability of audited accounts that is generally after a few months. Any client might hardly be prepared to offer its books of accounts for scrutiny while it has availed of the bank's capital at so cheap rate. (105)

تاہم عملی طور پر ایسا نہیں ہو سکتا کیوں کہ مطلوبہ عبوری منافع پہلے سے متعین منافع کی شرح کے مطابق کسٹمر سے لے لیا جاتا ہے۔ ممکنہ نقصان کا مطالبہ کمپنی کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے جو چند ماہ کے بعد ہوتا ہے۔ یہ تقریباً ناممکن ہے کہ کسٹمر بینک کے انتہائی کم شرح سود پر سرمائے سے فائدہ اٹھانے کے بعد اپنی کمپنی کے حساب کتاب کو جانچ پڑتال کے لیے پیش کرے۔

یعنی اسلامی بینک شرکت کے اختتام تک ماہانہ اقساط کی صورت میں ایکروئل بنیادوں پر اپنے کلائنٹ سے منافع پہلے ہی وصول کر چکا ہوتا ہے۔ نقصان کا علم تو اُس وقت ہی ہو سکتا ہے جب کلائنٹ اپنے مکمل بزنس کا حساب کتاب پیش کرے اور یہ عمل شرکت کے اختتام پر ہوتا ہے۔ اگر وہ نقصان ظاہر کرتا ہے تو اسے جانچ پڑتال

105- Muhammad Ayub, Ibid.

شدہ تمام حسابات اپنے بینک کو پیش کرنا ہوں گے اور کوئی بھی کلائنٹ بمشکل اس بات پر راضی ہوگا کہ وہ کم شرح سود سے فائدہ اٹھانے کے بعد اپنی کمپنی کے کھاتہ جات جانچ پڑتال کے لیے پیش کرے اور کلائنٹ کھو دینے کے خوف سے اسلامی بینک اس پوزیشن میں بھی نہیں ہوتے کہ وہ کلائنٹ کو ایسا کرنے پر مجبور کریں۔

سرمائے کی کفایت کا تناسب: رواں مشارکہ کا سرمایہ ایک قرض ہے

جیسا کہ اوپر بیان کی جا چکا ہے کہ رننگ مشارکہ میں دونوں کا سرمایہ باہم مخلوط نہیں کیا جاتا جس کی وجہ سے یہ بھی طے نہیں ہو پاتا کہ شریک کی حیثیت سے اسلامی بینک کون سے اثاثے کا مالک ہے تاکہ اُسے اشیا اور مارکیٹ کے خطرات کا سامنا کرنا پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ کلائنٹ کو اس بات کی آزادی مل جاتی ہے کہ وہ اسلامی بینک کی جانب سے رننگ مشارکہ کی مد میں منظور شدہ خطیر رقم کو جہاں چاہے استعمال کرے اور اس کے لیے کلائنٹ کو کسی قسم کی جوابدہی کی ضرورت بھی نہیں کہ اُس نے یہ رقم کہاں اور کیسے استعمال کی، اور نہ ہی اسلامی بینکوں نے کلائنٹ کی جوابدہی کے لیے کوئی طریقہ کار وضع کیا ہوا ہے۔ عین ممکن ہے کہ کلائنٹ نے وہ پیسہ کاروبار میں لگایا ہی نہ ہو بلکہ اس سے صرف اپنی دیگر ضروریات ہی پوری کی ہوں۔ گویا رننگ مشارکہ عملی طور پر نفع کی بنیاد پر دیا جانے والا ایک قرض ہے، جس کا قوی قرینہ یہ ہے کہ رننگ مشارکہ کی مد میں دی جانے والی رقم پر اسلامی بینک کو ”سرمائے کی کفایت کے تناسب“، جسے Capital Adequacy ratio کہا جاتا ہے، کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس پیرائے میں رننگ مشارکہ کا وجود ایک ایسا قرض ہے جس پر اسلامی بینک نفع وصول کرتا ہے جو شرع کی نظر میں سود قرار پاتا ہے۔[۱۰۶]

”سرمائے کی کفایت کا تناسب“ یا Capital Adequacy Ratio(CAR) مالیاتی علم کی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک مالیاتی ادارے کے ”سرمائے“ اور اس کے ”خطرات پر مبنی اثاثہ جات“ کا تناسب کیا ہے۔ مرکزی بینک تمام بینکوں پر یہ لازم کرتا ہے کہ وہ اپنے ”سرمائے کی کفایت کے تناسب“ سے متعلق معلومات فراہم کریں۔ اس کا بنیادی مقصد ڈپازٹرز کا تحفظ ہوتا ہے تاکہ اس تناسب سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ کہیں کوئی بینک اپنے پاس موجود سرمائے سے زیادہ خطرہ تو مول نہیں لے رہا۔ اس لیے خطرے کی بنیاد پر اثاثہ جات کی درجہ بندی کی جاتی ہے کہ کس اثاثے کا خطرہ کتنا ہے؟ اور اس کے لیے ویٹیج (Weightage) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے یعنی ہر اثاثے کو اس کے خطرے کی نوعیت کی بنیاد پر ایک خاص ویٹیج دیا جاتا ہے۔ چوں

106– op.cit, 16.

کہ قرضہ جات بھی اثاثے میں شمار ہوتے ہیں لیکن وہ چوں کہ مضمون بہ (Guaranteed) ہوتے ہیں اور ان کی وصولی یقینی ہوتی ہے اس لیے قرضہ جات کو صفر ویٹیج دیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کو "خطرات پر مبنی اثاثی جات" میں شمار نہیں کیا جاتا۔ جب کہ مشارکہ میں تو خطرہ موجود ہوتا ہے کیوں کہ اس میں شرکا نقصان کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ اس لیے مشارکہ کے سرمائے کو "خطرات پر مبنی اثاثی جات" میں شمار کیا جاتا ہے اور BASEL کے قواعد کے مطابق اُسے زیادہ رسک ویٹیج دیا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی بینکوں میں رننگ مشارکہ کی تمویلی سہولت کو "سرمائے کی کفایت کے تناسب" میں قابل خطرہ اثاثہ شمار نہ کیا جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ رننگ مشارکہ کی تمویلی سہولت درحقیقت قرض ہی ہے جس پر اسلامی بینک منافع وصول کرتا ہے اور قرض پر فائدہ سود کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

مشارکہ میں شرح منافع کی تعین کے لیے KIBOR کو معیار بنانا

فقہا اشیا کی قیمت اور کرائے کی تعین میں مارکیٹ کی شرح سود کو معیار کے طور پر لینے کو ناپسندیدہ خیال کرتے ہیں۔ مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۲۱)[۱۰۷] سے کسی نے سوال کیا کہ "زمین کے مالک نے زمین کے کرائے کو رائج الوقت شرح سود کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ کیا یہ کرایہ جو سود سے منسلک ہے جائز ہے؟" تو اُنھوں نے یہ جواب دیا" سود ملحوظ کر کے مقدارِ کرایہ متعیّن کرنا ایک ناپاک بات اور گندہ لحاظ ہے لیکن اگر (سودی شرح کی بنیاد پر کرایہ) معیّن ہو جائے تو اُس کرایہ میں حرج نہیں مثلاً اگر ۱۰۰۰ روپیہ زمین کی قیمت ہے اور شرح سود ۳٪ ہے اور مالک کہے کہ وہ زمین کی قیمت کا ۳٪ کرایہ وصول کرے گا اور سود کا نجس حساب لگا کر تیس روپے (x ۱۰۰۰ Rs. ۳۰ = ۳٪) ایک ماہ کا کرایہ قرار دیا تو وہ نجاست اُس لحاظ (سود) میں ہی رہی کرایہ میں نہ آئی۔"[۱۰۸] اسی موقف کی بنیاد پر ہی کہا جاتا ہے کہ اسلامی بینک کی پروڈکٹ کی قیمت میں کائبور کی نجاست اُس پروڈکٹ کی قیمت کو حرام نہیں کرے گی اگرچہ کائبور کو معیار بنانا پسندیدہ نہیں ہے کیوں کہ وہ ایک گندہ لحاظ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا رننگ مشارکہ میں بھی اسی شرح سود کو معیارِ نفع بنانا درست ہے؟

۱۰۷۔ مولانا احمد رضا خان بھارت کے شہر بریلی میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کو تقریباً پچپن علوم پر دست رس حاصل تھی۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ مختلف علوم و فنون پر بہت سی کتب اور رسائل تحریر کیے۔ آپ کے فتاویٰ جات کو عصر حاضر میں مرتب کیا گیا جو کہ تیس جلدوں پر محیط ایک فقہی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ آپ کی کتب کی تعداد چودہ سو تک بیان کی گئی ہے جن میں سے بہت سا ذخیرہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔ ۱۹۲۱ء کو آپ نے رحلت فرمائی۔ (ماخوذ از **سوانح امام احمد رضا** (سکھر: مکتبہ نوریہ رضویہ)، ۳۱۴۔

۱۰۸۔ مولانا احمد رضا خان، **فتاویٰ رضویہ** (لاہور: رضا اکیڈمی)، ۱۶: ۲۲۹۔

رننگ مشارکہ میں KIBOR کا استعمال اس انداز میں کیا جاتا ہے کہ اسلامی بینک اپنے سرمائے پر صرف KIBOR کے برابر نفع وصول کرتا ہے اور بقیہ کلائنٹ کو ہی دے دیتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ اسلامی بینک کا عرف بنتا جارہا ہے کہ اسلامی بینک تو صرف اپنے سرمائے پر متعین شرح کا نفع لیتا ہے جو کہ سود ہے اور اس وقت مارکیٹ میں یہی رائے عام ہے کہ اسلامی بینک اپنے سرمائے پر KIBOR سے زیادہ منافع نہیں لیتا۔ فقہ کا قاعدہ ہے کہ المعروف کالمشروط [۱۰۹] (جو بات لوگوں میں معروف ہو جائے وہ مشروط کی مانند ہوتی ہے)۔ لہذا یہ بات اب مشروط ہی شمار ہوگی کہ اسلامی بینک اپنے سرمائے پر KIBOR کی صورت شرطاً متعین شرح نفع لیتا ہے اور یہ سود کے زمرے میں آتا ہے۔ لہذا بیع کے برخلاف رننگ مشارکہ میں مارکیٹ کے شرح سود کو معیار بنانا شرعاً درست نہیں ہے۔

متعیّن حد سے زائد منافع: اسٹیٹ بینک آف پاکستان اور شریعہ بورڈ

متعیّن شرح منافع کی حد سے زائد منافع کلائنٹ کو دینے سے متعلق جہاں اسلامی بینکار اور اسلامی بینکوں میں کام کرنے والے علما یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر انھوں نے یہ سہولت نہ دی تو کلائنٹ سودی بینکوں کی جانب چلا جائے گا اس لیے مشارکہ پر حقیقی معنوں میں عمل نہیں ہو سکتا، وہیں وہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ایک سرکلر سے بھی دلیل پکڑتے ہیں، جس پر تمام بینکوں کا تعامل ہے تو اسلامی بینک بھی اسی عُرف پر عمل کرتے ہیں۔

To give more weightage to their decision, they also referred to the instructions of the State Bank vide BPD Circular No. 1 dated January 21, 2004 that binds the banks in Pakistan to benchmark all corporate lending, including the 'Overdraft and Running Finance' with the KIBOR with spread as the parties may mutually decide.[110]

اسلامی بینکوں کے شریعہ اسکالرز اپنے دلیل میں وزن پیدا کرنے کے لیے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے سرکلر BPD Circular No. 1 dated January 21, 2004 کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ جس کے تحت اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے تمام بینکوں پر یہ لازم کر دیا کہ کاروباری مقاصد کے لیے جاری کردہ قرضوں بشمول اوور ڈرافٹ اور رننگ فنانس کو KIBOR کی شرح سے وابستہ کرتے ہوئے کلائنٹ سے شرح منافع طے کریں۔

۱۰۹- ابن النجیم، **الأشباه والنظائر**، ۸۱۔

110- Muhammad Ayub, op.cit, 17.

ممکن ہے کہ وہ یہ دلیل پیش کرتے ہوں کہ مارکیٹ میں چوں کہ دیگر سودی بینک بھی اسی طرح کر رہے ہیں لہذا یہ مارکیٹ کا عُرف ہے اور عُرف ایک شرعی دلیل ہے جس کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ امام شاطبی (۷۹۰ھ)[۱۱۱] فرماتے ہیں: "لما قطعنا بأن الشارع جاء باعتبار المصالح لزم القطع بأنه لا بد من اعتباره العوائد"[۱۱۲] (جب ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ شارع نے مصالح کا اعتبار کیا ہے تو پھر یہ بات بھی یقینی ہے کہ شریعت عرف وعادت کا اعتبار کرتی ہے)۔ تاہم فقہا نے کسی بھی عُرف کے مقبول ہونے کے لیے چند شرائط مقرر کی ہیں۔ رننگ مشارکہ کے معاملے میں پیش کیے جانے والے اِس عُرف کی صحت کا فیصلہ انھی شرائط کی روشنی میں ہی کیا جائے گا۔

عُرف کی شرائط ذکر کرتے ہوئے امام ابن نجیم (۹۷۰ھ)[۱۱۳] لکھتے ہیں: "إِنَّمَا تُعْتَبَرُ الْعَادَةُ إِذَا اطَّرَدَتْ أَوْ غَلَبَتْ"[۱۱۴] (عرف کا اس وقت اعتبار کیا جائے گا جب وہ عام ہو یا غالب ہو)۔ یعنی فقہا کے نزدیک عُرف کے معتبر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کی غالب اکثریت کا اُس پر عمل ہو۔ دوسری شرط بیان

۱۱۱۔ ابو اسحق ابراہیم بن موسی غرناطہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے غرناطہ میں ہی پرورش پائی اور یہیں علم حاصل کیا اور مکمل زندگی یہیں بسر کی۔ اسی نسبت سے آپ کو غرناطی بھی کہا جاتا ہے۔ دیگر شہروں یا ملکوں کی جانب آپ کے سفر سے متعلق کوئی معلومات نہیں ملیں۔ فقہ مالکی کے مشہور محدث، فقیہ، لغوی اور جامع العلوم تھے جنھیں مجدد دین اسلام میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ آپ نے ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء کو وفات پائی۔ آپ کی تصانیف میں **الموافقات في أصول الفقه، الاتفاق في علم الاشتقاق، الاعتصام** قابل ذکر ہیں۔ (احمد الریسونی، **نظرية المقاصد عند الإمام الشاطبي**، (امریکہ: المعهد العالمي للفكر الإسلامي، ۱۹۹۵ء)، ص:۱۰۸۔)

۱۱۲۔ ابراہیم بن موسی الشاطبی (۷۹۰ھ)، **الموافقات**، (قاهرة: دار ابن عفان، ۱۹۹۷)، ۲: ۴۹۴۔

۱۱۳۔ امام زین الدین بن ابراہیم الحنفی ہے۔ آپ ابن النجیم کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی پیدائش ۹۲۶ھ/۱۵۱۹ء میں قاہرہ میں ہوئی۔ آپ نے قاہرہ کے علماء سے تحصیل علم کی۔ اساتذہ نے آپ کو درس وتدریس اور افتاء کی اجازت دی تھی۔ آپ فقیہ، اصولی اور محقق عالم تھے۔ آپ نے ۸/رجب المرجب ۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء کو وفات پائی۔ آپ کی تصانیف میں **البحر الرائق شرح كنز الدقائق، الرسائل الزينية في المسائل الحنفية، الأشباه والنظائر** قابل ذکر ہیں۔ (الزرکلی، مرجع سابق، ۳: ۶۴۔)

۱۱۴۔ امام زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم (۹۷۰ھ)، **الأشباه والنظائر** (بيروت: دار الكتب العلمية، ۱۹۹۹ء)، ۲۳۳۔

کرتے ہوئے امام ابن نجیم (۹۷۰ھ) لکھتے ہیں "الْعُرْفُ الَّذِي تُحْمَلُ عَلَيْهِ الْأَلْفَاظُ إِنَّمَا هُوَ الْمُقَارِنُ السَّابِقُ دُونَ الْمُتَأَخِّرِ؛ وَلِذَا قَالُوا لَا عِبْرَةَ بِالْعُرْفِ الطَّارِئِ" (وہ عرف جس پر الفاظ محمول کیے جاتے ہیں وہ ایسا عرف ہے جو متاخر ہونے کی بجائے گزشتہ زمانے سے چلا آرہا ہو، اسی لیے فقہانے کہا کہ عرف طاری کا کوئی اعتبار نہیں)۔ عرف طاری سے مراد وہ عرف ہوتا ہے جو نیا رائج ہوا ہو۔ اسے عرف حادث بھی کہا جاتا ہے۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ (۱۲۵۲ھ) کے ہاں ایسے عرف کے معتبر ہونے کے شواہد ان کی کتاب **مجموعة رسائل ابن عابدین** میں ملتے ہیں جس میں فقہ حنفی میں موجود ایسی امثلہ کا ذکر کرتے ہیں جہاں عرف حادث کا اعتبار کیا گیا ہے اور اس سے نصوص کی تخصیص کی گئی ہے۔[115] لیکن شیخ مصطفی احمد زرقا (۱۴۲۰ھ) نے علامہ شامیؒ کے نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور حنفی فقہ میں موجود عُرف حادث کے معتبر ہونے کی امثلہ کو استثنائی صورتیں قرار دیا ہے۔ عُرف حادث کو غیر معتبر قرار دینے کی دلیل دیتے ہوئے شیخ مصطفی احمد زرقا کہتے ہیں کہ اگر عرف طاری کا اعتبار کیا جائے تو روز بروز نت نئے عرف شرعی احکام کی جگہ لے لیں گے اور شریعت بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔[116] عُرف کے معتبر ہونے کی تیسری شرط یہ ہے کہ وہ کسی نص کے خلاف واقع نہ ہوا ہو، جیسے علامہ ابن عابدین شامیؒ (۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں: "ولا اعتبار للعرف المخالف للنص، لأن العرف قد يكون على باطل بخلاف النص"[117] (اور نص کے مخالف کسی عُرف کا اعتبار نہیں ہوگا، کیوں کہ کبھی کبھار عُرف باطل تصور پر بھی قائم ہو جاتا ہے)۔ تاہم علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۵۲ھ) **القنية** کے حوالے سے کہتے ہیں: "ليس للمفتي و لا للقاضي ان يحكما على ظاهر المذهب يتركا العرف"[118] (مفتی اور قاضی کے لیے عرف کے خلاف ظاہر مذہب پر فتوی دینا جائز نہیں ہے)۔ لیکن اس کے ساتھ یہ تصریح بھی کر دی کہ یہ اُس وقت ہوگا جب ظاہر مذہب کے علاوہ اُس عُرف کو بھی مشائخ نے درست قرار دیا ہوگا، کیوں کہ اکثر اوقات ظاہر الروایہ کسی صریح نص پر مبنی ہوتی ہے تو پھر عُرف کے لیے اُسے کیسے ترک کیا جا سکتا ہے۔[119]

۱۱۵۔ محمد امینؒ المعروف بابن عابدین (۱۲۵۲ھ)، **مجموعة رسائل ابن عابدين**، (طبع غیر معلوم)، ۲: ۱۲۲۔

۱۱۶۔ شیخ مصطفی احمد زرقا (۱۴۲۰ھ)، **المدخل الفقهي العام** (دمشق: دارالقلم، ۲۰۰۴ء)، ۲: ۹۱۹۔

۱۱۷۔ ابن عابدین، **مجموعة رسائل ابن عابدين**، ۲: ۱۱۵۔

۱۱۸۔ نفس مصدر۔

۱۱۹۔ نفس مصدر۔

عُرف کے معتبر ہونے کی ان بنیادی شرائط کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامک بینکنگ کی دنیا میں شرح منافع کی تعیین کا یہ عُرف نہ تو عام ہے اور نہ ہی غالب اکثریت کا اس پر تعامل ہے۔ شرح منافع کی تعیین کو اگر ظاہر الروایہ بھی تسلیم کیا جائے تو بھی اس عُرف کے باطل ہونے کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ سودی بینکوں کا یہ عُرف سب سے پہلے تو نص کے مخالف ہے۔ کیوں کہ شرح منافع متعیّن کرنے کا یہ انداز درحقیقت سود ہے جس کی حرمت ایک منصوص امر ہے اور جب عُرف نص کے خلاف ہو تو اس کو رد کر دیا جاتا ہے۔ نیز سودی بینکوں کا عُرف اسلامی بینکوں کے لیے دلیل نہیں بن سکتا کیوں کہ جس نظام کی مبادیات ہی شریعت کے خلاف ہوں اسلامی نظام اس سے استدلال کیسے کر سکتا ہے۔ اسلامی بینکوں کا ایک اپنا عُرف ہونا چاہیے اور اس کے لیے اسلامی بینکوں کے شریعہ بورڈز اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو اس بارے میں تجاویز دیں تا کہ اسلامی بینکاری کے معاملات شرع کے مطابق مکمل ہوں۔ اس طرح مستقبل کے معاملات میں آج کے معاملات کا تعامل ایک عرفِ حادث کی شکل اختیار کرے گا لیکن یہ ایک ایسا عُرف ہو گا جو شرعی احکامات کے خلاف بھی نہیں ہو گا اور عین ممکن ہے کہ موجودہ دور کے فقہا علامہ ابن عابدین (۱۲۵۲ھ) کے موقف کی تائید کرتے ہوئے اُسے قابل عمل قرار دیں۔ لہٰذا اس بارے میں متعلقہ شریعہ ایڈوائزرز فقہا کو کوشش کرنا ہوگی۔ محمد ایوب صاحب اسلامی بینکاروں کی جانب سے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے سرکلر کو دلیل بنانے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

This argument carries little weight because firstly, giving OD Limit is the function of the conventional banks, not obligatory for Islamic banks, and secondly, the Shari'ah rules cannot be made subservient to the regulatory rules for the conventional finance. Further ,the Circular allows some exemptions and the Shari'ah Boards of the IBIs should have suggested to the State Bank to allow exemption to Islamic banks as philosophy of Islamic banking does not allow fixing the return rate in mushārakah as in case of debt.[120]

اول تو یہ دلیل بہت ہی کم زور ہے کیوں کہ اپنے کلائنٹ کے لیے اوورڈرافٹ کی حد مقرر کرنا سودی بینکوں کا کام ہے، یہ اسلامی بینکوں کے لیے لازمی نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ شرعی اصولوں کو روایتی مالیات کے ریگولیٹری قوانین کے ماتحت نہیں بنایا جا سکتا۔ مزید براں

120– Muhammad Ayub, op.cit, 18.

اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے اس سرکلر میں چند استثناء بھی دی گئی ہیں جن کی روشنی میں اسلامی بینکنگ انڈسٹری کے شریعہ بورڈ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو یہ تجویز کر سکتے تھے کہ اسلامی بینکاری کے بنیادی فلسفے کے مطابق اسلامی بینک مشارکہ کے معاملات میں منافع کی مقدار اُس انداز میں پہلے سے مقرر نہیں کر سکتے جیسے قرضوں کے معاملوں میں سودی بینک مقرر کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے جناب محمد ایوب صاحب کا شکوہ بجا ہے کہ اسلامی بینکوں کے شریعہ بورڈز کو مجموعی طور پر یہ آواز اٹھانی چاہیے تھی کہ جہاں اس سرکلر میں دیگر استثناد یے جارہے ہیں جیسے ایکسپورٹ فنانس اسکیم، SME فنانسنگ، وغیرہ، تو وہیں اسلامی بینکوں کے مشارکہ کو بھی مستثنیٰ کیا جائے۔ دیگر اسلامی بینکوں کے شریعہ ایڈوائزرز ایسے بھی ہیں جو اسٹیٹ بینک کے شریعہ بورڈ کا حصہ بھی ہیں تو یہ آواز کہیں زیادہ مضبوط ہو سکتی تھی، لیکن یہ آواز اٹھائی نہیں گئی۔ تاہم اب یہ امر خوش آئند ہے کہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے رننگ مشارکہ پر محمد ایوب صاحب کے تنقیدی آڈیٹوریل کے بعد اسلامی بینکوں کو چند شرائط کے ساتھ یہ استثناء فراہم کرتے ہوئے ۸ ستمبر ۲۰۱۶ کو یہ سرکلر جاری کیا ہے:

It has been decided that the financing provided on the basis of participatory (Musharakah & Mudarabah) and Wakalah (Agency) modes by the Islamic Banking Institutions (IBIs) shall also be exempted from the requirement of using KIBOR as benchmark rate.[121]

یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسلامی بینک شراکت (شرکت اور مضاربت) اور وکالہ برائے سرمایہ کاری کے ذریعے فراہم کی گئی تمویلی سہولتوں کے لیے شرح منافع کے تعین میں KIBOR کو معیار کے طور پر استعمال کرنے سے مستثنیٰ ہوں گی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب سارا معاملہ اسلامی بینکوں اور ان کے علما پر آچکا ہے۔ شریعہ بورڈز کے علما کا فرض بنتا ہے کہ وہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی دیے گئے اس استثنا کو عملاً نافذ کروائیں کیوں کہ اب تو ریگولیٹری اتھارٹی کی جانب سے مجبور کیے جانے کا جواز بھی ختم ہو چکا ہے۔ اگر اسلامی بینکوں کو آج نہ روکا گیا تو پھر شاید یہ معاملہ

121- State Bank of Pakistan, IDB Circular No. 01 of 2016, Exemption from KIBOR as Benchmark rate for Participatory and Wakalah Modes Based Products.

یہیں نہیں رکے گا بلکہ یہ کئی اور برائیوں کو جنم دے گا۔ پھر شاید اسلامی بینکاری جس سودی طوفان کا راستہ روکنے کے لیے وجود میں آئی تھی اُسی کی رَو میں بہہ جائے گی۔ سرمایہ دار افراد کے لالچ کو ضرورت شرعی قرار دیتے ہوئے ممنوع معاملات میں رخصت دینا اگر شرع کا مقصود ہوتا تو شاید سود سرے سے حرام ہی نہ کیا جاتا۔

مندرجہ بالا ساری بحث سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حقیقت میں رننگ مشارکہ رننگ فنانس کی ہی ایک مسخ شدہ شکل ہے، جسے چند ایک مصنوعی حیلوں کے ذریعے رننگ فنانس سے جدا ایک الگ تصور بنانے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ رننگ مشارکہ کے تصور کو اگر مقاصد اور مآلات کے ہر دو اصولوں کی روشنی میں بھی دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ رننگ فنانس کی مانند سرمایہ دار کی جیب بھرنے کا ذریعہ ہے اور منصفانہ تقسیم دولت میں اس کا کوئی کردار نہیں۔ بلکہ رننگ فنانس کی طرح دولت کو چند ہاتھوں میں محدود کر دینے کا ایک ذریعہ ہے۔

نتیجہ	رننگ مشارکہ	رننگ فنانس
رننگ فنانس اور رننگ مشارکہ کا تقابلی چارٹ		
نام کا فرق ہے تاہم مقصد ایک ہے۔	رننگ مشارکہ کا عقد شرکت العقد کی بنیاد پر طے کیا جاتا ہے۔ جس کا مقصد کلائنٹ کو سرمایہ فراہم کر کے اس پر نفع کمانا ہوتا ہے۔	رننگ فنانس کا عقد قرض کی بنیاد پر طے کیا جاتا ہے، جس کا مقصد کلائنٹ کو سرمایہ فراہم کر کے اس پر نفع کمانا ہوتا ہے۔
کوئی فرق نہیں	رننگ مشارکہ میں کلائنٹ "جب اور جتنی چاہے" کی بنیاد پر رقم نکلوا اور جمع کراتا ہے	رننگ فنانس میں کلائنٹ "جب اور جتنی چاہے" کی بنیاد پر رقم نکلوا اور جمع کراتا ہے
کوئی فرق نہیں	رننگ مشارکہ میں اسلامی بینک کے سرمائے کی مقدار کا تعین عقد کے آخر میں ہوتا ہے۔	سودی بینک کتنے سرمائے پر شرح سود چارج کرے گا اس سرمائے کی مقدار کا حتمی تعین عقد کے آخر میں ہوتا ہے۔
حالاں کہ رننگ مشارکہ میں یہ تعین ابتدا میں ہونا چاہیے۔	رننگ مشارکہ میں شرح منافع کا تعین انتہائے عقد میں ہوتا ہے۔	رننگ فنانس میں شرح سود کا تعین ابتدائے عقد میں ہو جاتا ہے۔
دنوں میں سرمائے پر KIBOR کے برابر منافع وصول کیا جاتا ہے۔	رننگ مشارکہ میں منافع کی ایک حد مقرر کی جاتی ہے اور اس حد تک منافع میں اسلامی بینک اپنے سرمائے پر KIBOR کی شرح کر برابر منافع وصول کرتا ہے۔ حد سے زائد منافع میں اسلامی بینک اپنے لیے ۱۰۰۰۰. فیصد منافع لیتا ہے۔	رننگ فنانس میں کلائنٹ سودی بینک کی استعمال کی گئی رقم پر پہلے سے طے کردہ شرح سود KIBOR کے مطابق سود ادا کرتا ہے۔ رننگ فنانس میں شرح سود کسی منافع کی حد سے منسلک نہیں ہوتی۔
کوئی فرق نہیں	رننگ مشارکہ میں Accrual بنیادوں پر KIBOR	رننگ فنانس میں Accrual بنیادوں پر

	کے برابر ماہانہ منافع وصول کیا جاتا ہے۔	KIBOR کے برابر ماہانہ منافع وصول کیا جاتا ہے۔
کوئی فرق نہیں	رننگ مشارکہ میں کلائنٹ سرمائے کی رقم کو مشارکہ بزنس میں لگاتا ہے یا کسی اور مد میں صرف کرتا ہے اس سے اسلامی بینک کو کوئی سروکار نہیں ہوتا	رننگ فنانس میں کلائنٹ اس رقم کو کس مد میں صرف کرتا ہے اس سے بینک کو کوئی سروکار نہیں ہوتا
کوئی فرق نہیں	کل منافع میں سے زیادہ رقم کلائنٹ لے جاتا ہے، جب کہ ڈپازٹر میں بہت تھوڑا منافع تقسیم کیا جاتا ہے۔ حد سے زائد منافع میں اسلامی بینک کے ڈپازٹرز کا بطور رب المال حق ہوتا ہے جس سے اسلامی بینک دست بردار ہو جاتا ہے۔	کل منافع میں سے زیادہ رقم کلائنٹ لے جاتا ہے، اور ڈپازٹرز کو ان کے اصلی حق سے محروم کرتے ہوئے بہت تھوڑا منافع دیا جاتا ہے۔
کوئی فرق نہیں	رننگ مشارکہ میں کلائنٹ کو پہنچنے والے نقصان کا اندازہ لگانے سے متعلق کوئی ٹھوس اقدامات نہیں کیے جاتے۔ اسلامی بینک عملاً کلائنٹ کو کاروباری حساب کتاب پیش کرنے پر مجبور نہیں کرتا کہ حقیقی نفع یا نقصان کا اندازہ لگایا جا سکے۔ لہذا یہاں بھی عملاً نقصان سے لاتعلقی ہی نظر آتی ہے۔	رننگ فنانس میں بینک کلائنٹ کو پہنچنے والے نقصان سے لاتعلق ہوتا ہے۔
کوئی فرق نہیں	رننگ مشارکہ میں کلائنٹ سے زیادہ کاغذی کارروائی مطلوب نہیں ہوتی۔	رننگ فنانس میں کلائنٹ سے زیادہ کاغذی کارروائی مطلوب نہیں ہوتی۔
کوئی فرق نہیں	رننگ مشارکہ میں بینک کلائنٹ کے بزنس سے عملاً لاتعلق ہوتا ہے۔	رننگ فنانس میں بینک کلائنٹ کے بزنس سے عملاً لاتعلق ہوتا ہے۔
کوئی فرق نہیں	رننگ مشارکہ میں اسلامی بینک اپنے کلائنٹ کے کاروباری دیون کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ حالاں کہ شریک ہونے کی حیثیت میں دیون کی ذمہ داری مشترکہ ہونی چاہیے تھی۔	رننگ فنانس میں بینک اپنے کلائنٹ کے کاروباری دیون کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔

نتیجہ بحث

پاکستان میں اسلامی بینکاری کا حقیقی سفر ۱۹۸۰ء سے شروع ہوا پھر ۱۹۹۱ء میں وفاقی شرعی عدالت پاکستان کے سود کے خاتمے کا واضح تاریخی فیصلہ اور اس کا التوا پھر ۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کو سپریم کورٹ کے وفاقی شرعی عدالت

کے فیصلے کو برقرار رکھنے جیسے سنگ میل عبور کرنا اور بالآخر جنوری ۲۰۰۳ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی جانب سے باقاعدہ عملی آغاز کی سند وصول کرنا اور کئی دہائیوں پر مشتمل سفر کے بعد جب اسلامی بینکاری کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے سودی بینک کے مالکان کا اپنے سودی نظام کے متوازی اسلامی بینکاری شروع کرنا، یہ سب اسلامی بینکاری کی کامیابی کی علامتیں ہیں لہٰذا آج اسلامی بینکوں کے لیے یہ ممکن ہو چکا ہے کہ وہ اب مارکیٹ کی غیر شرعی مجبوریوں کو دلیل بنانے کی بجائے صحیح معنوں میں شرعی اصولوں کے مطابق اپنے معاملات سرانجام دیں۔ جہاں اسلامی بینک کے معاملات شرع کے مطابق سرانجام پائیں گے وہیں اسلامی بینکوں کا ایک ایسا عُرف قائم ہو گا جو مستقبل بعید میں ایک شرعی دلیل بن سکے گا اور لوگوں کے لیے یُسر کا باعث بنے گا۔

رننگ مشارکہ میں اسلامی بینک عملاً اپنے سرمائے کا مروجہ KIBOR (۷ فیصد) کے برابر منافع وصول کرتا ہے اور اس سے زائد نفع میں سے ہر ایک لاکھ روپے پر ایک روپیہ وصول کرتا ہے یعنی اگر زائد نفع ایک کروڑ ہو تو اسلامی بینک اس میں صرف دو سو دو روپے وصول کرتا ہے اور بقیہ صنعت کار کلائنٹ کو دے دیا جاتا ہے۔ اسلامی بینک اُس ایک سو روپے کو اپنے ہزاروں ڈپازٹر میں تقسیم کرتا ہے۔ منافع کی یہ تقسیم حقیقی سرمایہ فراہم کرنے والے ڈپازٹر کی معاشی فلاح و بہبود میں کس قدر مؤثر ہو گی اہل علم سے مخفی نہیں ہے۔ اسلامی بینک در حقیقت اپنے صنعت کار کلائنٹ کو ہبہ کرنا چاہتے ہیں اور شریعت مضارب کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ رب المال کے حق میں سے کچھ ہبہ یا صدقہ کرے۔ اس اعتراض سے بچنے کے لیے اسلامی بینک منافع کی تقسیم کا یہ انداز اختیار کرتے ہیں تاکہ اس پر ہبہ کا اعتراض لازم نہ آئے، لیکن شرع میں معاملات کی ظاہری شکل و صورت کے ساتھ اس کے نتائج کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے اور اس نظم میں رننگ مشارکہ نام کی تبدیلی کے ساتھ رننگ فنانس کی مانند ہی استحصالی نتائج کا سبب بنتا ہے۔

رننگ مشارکہ اہل علم کو بالخصوص اور عوام الناس کو بالعموم اسلامی بینکوں اور متعلقہ شریعہ ایڈوائزرز کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کر رہا ہے۔ ایسی غیر شرعی پروڈکٹ کو غیر شرعی حیلوں کی بنیاد پر سندِ جواز کا مل جانا اسلامی بینکاری کی روح کو بھی کمزور کر رہا ہے۔ سودی بینکوں اور سودی مارکیٹ کا عرف اسلامی بینکوں کے لیے کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔ اگر اُن کا عرف شرع میں مقبول ہوتا تو شاید اسلامی بینکاری نظام کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ اگر اسلامی بینکوں کے شریعہ بورڈز اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے اس طرف توجہ نہ دی تو خاکم بدہن یہ نظام آگے جانے کی بجائے پھر وہیں لا کھڑا کرے گا جہاں سے یہ سفر شروع ہوا تھا۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو یہ تجویز دی جا سکتی ہے کہ وہ اسلامی بینکوں پر لازم کرے کہ اگر انھوں نے شراکت کے تحت فنانسنگ کرنی ہے تو

شراکت کے شرعی اصولوں کی پاسداری کرنی ہوگی۔ موجودہ صورت میں رننگ مشارکہ کسی صورت جاری نہیں رہنا چاہیے۔ اگر اسلامی بینک کسی کلائنٹ کو مشارکہ کے تحت فنانس کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے وہی طریقہ مناسب ہے جو فقہانے دیا ہے اور جو المعايير الشرعية نے تجویز کیا ہے۔ شریک کی حیثیت میں شراکت کی ابتدا میں ہی سرمائے کی مقدار کا علم، شرح منافع کی حتمی تعیین، مشترکہ اثاثہ جات میں مشترکہ خطرہ، نقصان معلوم کرنے کے لیے کلائنٹ کا کاروباری کھاتے پیش کرنے جیسے اہم امور حقیقی بنیادوں پر مکمل ہونے چاہییں۔ صرف کاغذی کارروائی کے ذریعے اسلام کے متوازن تقسیم دولت کے بنیادی مقصد کو پورا نہیں کیا جاسکتا۔